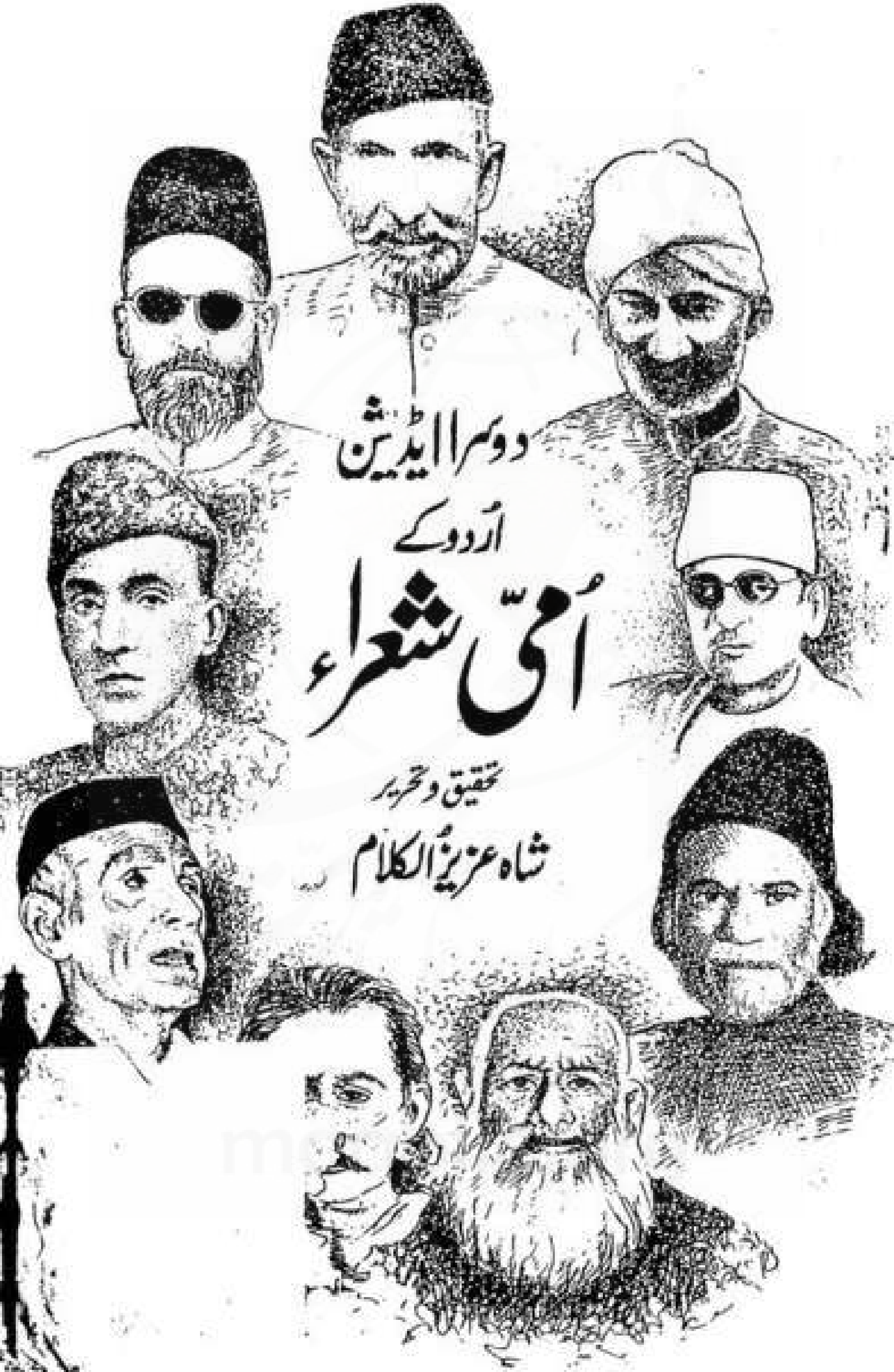

دوسرا ایڈیشن

اردو کے

اُمّی شعراء

تحقیق و تحریر

شاہ عزیزُ الکلام

300

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مؤلف

کتاب "اردو کے اُمی شعراء" تقریباً ۴ سال ہوئے زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ کتاب ہذا کو شہود و جود میں آتے ہی اس قدر مقبولیت و پذیرائی حاصل ہوئی کہ ۴ سال کے اندر مطبوعہ کتاب ختم ہو گئی۔ مشتاقین شعری ادب کی تشنگی اور اہلِ علم احباب پیہم تقاضوں کے پیش نظر جلد از جلد دوسرے ایڈیشن کا اہتمام کرنا پڑا۔ دورانِ اشاعت کتاب ہذا پاکستان کے مستند و ممتاز ادباء، شعراء اور ماہرین لسانیات کے ملاحظہ میں آئی جنہوں نے احقر کی اس کوشش کو سراہا اور اپنے گرانقدر تاثرات سے نوازا جن کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

احقر

شاہ عزیز الکلام

maablib.org

۱

ممتاز ادباء، شعراء و ناقدین ادب کی آراء

پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اردو غزل کے اولین بڑے شاعر ولی کا قول ہے کہ

راہ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن

ولی کے اس باب سخن میں سخن فہمی و سخن شناسی کو بھی شامل سمجھنا چاہئے اس لئے کہ جس طرح ایک جدت پسند شاعر اپنی ایک الگ راہ ہمہ حال نکال لیتا ہے اسی طرح ایک بلند پایہ اور نکتہ سنج سخن شناس بھی اپنی تحقیق و تنقید کیلئے نئے زاویے اور تازہ بتازہ پہلو تراش لیتا ہے۔ اس کی ایک دلچسپ اور قابل قدر مثال، جناب شاہ عزیز الکلام کی وہ کاوش ادبی ہے جو ابھی حال ہی میں "اردو کے امی شعراء" کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھوتی ہے اور اردو شاعری کی دو سو سالہ تاریخ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں اور ذی بعض شعراء کے حالات و سوانح کی تحقیق میں شاہ عزیز الکلام نے کیسی عرق ریزی و جانفشانی سے کام لیا ہے اس کا صحیح اندازہ میرے کہنے سے نہیں بلکہ کتاب کے مطالعے سے ہو سکتا ہے اس لئے میں اردو ادب کے قارئین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب پر ایک نظر ڈالیں اور اس بات کو اپنے مطالعے اور غور و فکر کا جزو بنائیں کہ جینئس اور لگن سے کام کرنے والے اہل قلم، فرسودہ مباحث سے کس طرح جدت و تازگی کے پہلو تراش کر ادب میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔

پروفیسر حسنین کاظمی

انسان کی صلاحیتوں اور صفات کے حوالے سے مصحفی نے کہا ہے کہ

مخلوق ہوں یا خالق مخلوق نما ہوں
معلوم نہیں مجھ کو میں کون ہوں کیا ہوں

اور یہی حقیقت انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ انسان جدت پسند بھی ہے اور تخلیق کار بھی۔ فنی اور تکنیکی ترقیاں اس کی جدت پسندی کی مظہر ہیں۔ علمی ادبی اور تصویری فن پارے اس کے تخلیقی صلاحیت کا ثبوت ہیں۔ ضروریات کے اظہار کیلئے تو انسان اشاروں سے بھی کام لے سکتا ہے لیکن احساسات، جذبات اور افکار کے اظہار کیلئے یا تو قلم کی ضرورت ہوتی ہے یا موقلم کی۔

جناب شاہ عزیز الکلام نے اردو ادب کے میدان میں ایک اہم کام کیا ہے انہوں نے برسوں کی محنت کے بعد اپنی تحقیقی جدوجہد کو امی شعراء کی صورت میں مرتب کیا ہے اس میں ۱۳۰ شعراء کے مختصر حالات زندگی اور نمونہ کلام شامل ہیں۔ شاہ صاحب کا نام عزیز الکلام ہے اور اپنی اس کاوش کے ذریعے انہوں نے انسان کی صفت کلام کی توانائی اور اہمیت واضح کرتے ہوئے اپنے

کام کی معنویت بھی غیر ارادی طور پر نمایاں کی ہے انہوں نے اس کوشش کے ذریعے واضح کیا ہے کہ کلام کے ذریعے انسان کی تخلیقی قوت کا اظہار درسی علم سے جدا تو پا سکتا ہے لیکن اس کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ ۱۲۰ شعراء اس دعوے کا ثبوت ہیں۔

"اردو کے امی شعراء" کی اتنی بڑی تعداد کے بارے میں تحقیق کرنے، حالات زندگی اور نمونہ کلام حاصل کرنے اور اسے مرتب کر کے کتابی صورت میں پیش کرنے میں کامیابی بجائے خود ایک بڑا علمی ادبی کام ہے جس کی تکمیل پر محترم عزیز الکلام صاحب مبارکباد اور عزت و توقیر کے مستحق ہیں۔ یہ کام برصغیر کے مسلمانوں کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی روایات کو زندہ رکھنے کی مخلص کوششوں کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ نئی نسل کو اپنی علمی و ادبی روایات سے باخبر رکھنے کی جانب اس نوعیت کے کام ضروری ہیں۔ گو کہ یہ کام بہت دشوار ہوتے ہیں لیکن بزرگوں کو ایسے مشکل کام کرنے چاہئیں۔ اس سے صرف روایات ہی منتقل نہیں ہوتیں، عزم و ہمت کے ساتھ کام کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کی مثال بھی قائم ہوتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر

"اردو کے امی شعراء" (تحقیق و تحریر شاہ عزیز الکلام) زیر مطالعہ آئی۔ اس کا انتساب نئی نسل کے نام کیا گیا ہے اس قوی امید کے ساتھ کہ نئی نسل اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے اور ترقی دینے میں کوتاہی نہیں کرے گی۔

اس کتاب کا عنوان اس کے اندر کے پن کی غمازی کرتا ہے۔ اس میں برصغیر پاک و ہند کے ۱۱۹ شاعروں کا تذکرہ موجود ہے۔ بعض نامور شعراء بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ اس سے اس امر کی بھی شہادت ملتی ہے کہ شعر گوئی عطیہ خداوندی ہے ماحول میں شعریت رچی بسی ہو تو استاد پر ہی علم کے زیور سے آراستگی ضروری نہیں بلکہ ذہانت، شوق اور طبیعت کی موزونیت فکر و فن کا باعث بنتی ہے۔

شاہ عزیز الکلام نے بڑی محنت، لگن اور ولولے سے مواد کو یکجا کیا ہے بعد ازاں دلچسپ، متاثر کن اور دلربا انداز میں صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے یہ تذکرہ معتبر ذرائع پر مبنی ہے۔

مولف علمی اور تحقیقی دنیا کی جانب سے قابل صد مبارک اور لائق تحسین ہیں یہ ان کے دل کی روشنی کا حاصل ہے۔ صداقی

تحقیق کائنات کی بھی غور چاہئے
اور اپنے دل کی روشنی تیز کیجئے

ہم خون جگر کے پھولوں سے تزئین بہاراں کرتے ہیں
خود چاک گریباں رہتے ہیں تعمیر گلستاں کرتے ہیں

پروفیسر محسن احسان

"شاہ عزیز الکلام اور اردو اکیڈمی پاکستان قابل مبارکباد اور لائق صد تحسین ہیں کہ انہوں نے اردو کے امی شعراء کے عنوان سے کتاب مرتب کر کے اہل ذوق اور اہل علم پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ شاعر کو اللہ نے اظہار اور ابلاغ کی وہ صلاحیت بخشی ہوتی ہے جس سے اکثر اوقات اہل علم محروم ہوتے ہیں۔ شاعری دل کی تہوں سے پھوٹنے والا وہ سرچشمہ ہے جس سے انسان پر ذات و کائنات کے مسائل کھلتے چلے جاتے ہیں اور وہ خود کو اس بلند و بالا مقام پر فائز پاتا ہے جس سے اکثر اہل فکر و دانش محروم ہوتے ہیں۔ اردو شاعری خوش نصیب ہے کہ اس میں بھی امی شعراء کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جنہوں نے اپنے فن اور کمال غزل گوئی کی وجہ سے دلوں کو موہ لیا۔ یہ شعراء کسی کالج یا یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنی ذہانت شوق اور موزونی طبع سے ایوان فن میں بلند مرتبہ حاصل کیا۔

شاہ عزیز الکلام نے یہ کتاب ترتیب دے کر قارئین کے معلومات میں اضافہ کیا ہے اور اسے ایک نئے زاویے سے روشناس کرایا ہے اب اس سلسلے کو جاری رہنا چاہئے کہ کئی امی شعراء اس

میں شامل نہیں ہو سکے۔ تلاش و جستجو سے کئی اور نام بھی سامنے آئیں گے۔

پروفیسر شوکت واسطی

عزیز الکلام صاحب بڑی خوبیوں کے انسان ہیں موصوف نے گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اردو کے امی شعراء شائع کر کے ہم سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ تحقیق فن بہت بڑا شعبہ ہے ہزاروں لاکھوں اس میں لگے ہوئے ہیں تحقیق و تدقیق کا مرحلہ وسعت کے اعتبار سے کم نہیں ہے اور بڑے بڑے سیانے بڑی داری سے چھان بین کے عمل میں مشغول ہیں۔ شاہ عزیز الکلام صاحب نے اس ضمن میں بڑے جوکھم کا کام سرانجام دیا۔ ایک یا بالکل ان چھوا فن کا اردو زبان میں کھوج لگایا ان کے کوائف اکٹھے کئے اور پھر یہ سلسلہ تمام ہندوپاک تک پھیلایا۔ گری گری گلی ہمارے کے گھومنے کا عمل رہا ہو گا' زمانے کے جھاڑ جھنکار کو ٹٹولنا' پھرولنا' مرور ایام کی گرد کو جھاڑنا پھٹکنا کوئی کھیل نہیں ہے ——— دل گردہ چاہئے اس کے لئے۔ آدمی حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اردو کے امی شعراء کے سلسلہ میں جو کارنامہ شاہ صاحب نے سرانجام دیا ہے اس کو جتنا بھی سراہا جائے ان کی محنت شاقہ کی مکمل داد نہ دی جا سکے گی۔

شاہ عزیز الکلام صاحب نے اردو ادب میں اپنی اس کتاب سے ہمارے ادبی تاریخ کے ایک گم کردہ باب کی دریافت سے انتہائی قابل توجہ کام انجام دیا ہے۔ ہمارے حکومتی سرمائے سے چلنے والے کئی ادارے جو ادبیات کے متعدد شمار ہوتے ہیں اور وہ جامعات جہاں ادب کی درس و تدریس پر شبانہ روز وقت قربانی جاری ہے اور ایسے "بورڈ" "انجمنیں" "مراکز اور ادارے" جو سرکاری یا نیم سرکاری طور پر علوم اردو تحقیق و تدقیق کے داعی ہیں حیف اس طرف سے کیسے غافل رہے ——— کوئی ریسرچ کرائی گئی ہے۔ ایم فل کے لئے یہ موضوع تجویز ہوا نہ پی ایچ ڈی کے لئے اس پر مقالہ رقم کرایا گیا۔

اردو کے امی شعراء اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کی تحریر تحقیق و ترتیب پر شاہ عزیز الکلام قابل مبارک باد ہیں اور اردو اکیڈمی' پاکستان' کراچی نے اسے چھاپ کر اردو زبان کے ایک بہت بڑے خلا کو پر کر دیا ہے۔

پروفیسر علی حیدر ملک

"اردو کے امی شعراء" یہ موضوع یقیناً اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔ اس میں ندرت کا عنصر بھی ہے اور تجسس کا پہلو بھی۔ یہ دراصل ایک تذکرہ ہے جس میں ایک خاص زاویے سے ۱۷۸۳ء سے ۱۹۸۳ء تک دو سو سال کے ۱۱۸ شعراء کے کوائف اور نمونہ ہائے کلام درج کئے گئے ہیں زیر نظر تذکرے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایسے شعراء کو بھی شامل کیا گیا ہے جو بنیادی طور پر کسی اور زبان کے شاعر تھے لیکن انہوں نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی تھی اس کے ساتھ ان غیر ملکی شعراء کو بھی شامل کیا گیا ہے جنہوں نے برصغیر میں سکونت اختیار کر لی اور اردو میں شعر گوئی کی۔

حقیقت ہے کہ بہت سے شعراء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے رسمی یا غیر رسمی تعلیم بالکل نہیں حاصل کی تھی حتیٰ کہ وہ حرف آشنا بھی نہیں تھے لیکن خداداد صلاحیت اور طبع موزوں کی بنا پر وہ شعر کہتے اور مشاعروں میں پڑھتے بھی تھے۔

شاہ عزیز الکلام صاحب کو اس بات کی داد ملنی چاہئے کہ انہوں نے تحقیق کے لئے ایک اچھوتے موضوع کا انتخاب کیا اور حتی المقدور اس پر محنت بھی کی ہے "اردو کے امی شعراء" بہرحال ایک اہم موضوع ہے اور اس پر مزید تحقیق کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

شاہ عزیز الکلام کراچی کی ادبی و ثقافتی زندگی کے مستعد اور سرگرم رکن ہیں اس کا ثبوت ان کی تالیف "اردو کے امی شعراء ہے" انہوں نے پہلے سے مشہور اور اقلیم شعر و فن کے سنگھاسن پر براجمان شعراء پر تحقیق التفات اور عنایت مزید کی' بجائے اپنے رخش تحریر کو ان شعرائے اردو کی طرف مہمیز کیا جن کا کوئی شعبہ تعلقات عامہ قائم نہیں ہے بلکہ یہ شعراء جن کی صلاحیت

شعر و سخن و فطری اظہار جذبات کے قائل ہوتے ہیں ذندہ و روشن ہیں۔

تاریخ کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ بابا آدم و اماں حوا نے مکہ مکرمہ میں آباد ہو کر دنیوی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید نے مکہ مکرمہ کو ام القریٰ کا نام دیکر منکشف کیا۔ ام القریٰ مکہ مکرمہ کا محض نام نہیں بلکہ یہ اسم صفاتی اور خود اس کی صحیح تاریخ بھی ہے۔ ام پر ابن خلدون، راغب اصفہانی، حافظ ابن تیمیہ نے بڑی روشنی ڈالی ہے اور ام القریٰ یعنی شہروں کی ماں کے معانی و مفہوم کے طور پر استعمال کیا ہے یوں ام القریٰ کے رہنے والوں بالخصوص شعراء کو امی کہا گیا ہے خود خالق کائنات نے مکہ کے باشندوں حتیٰ کہ اپنے عظیم پیغمبر آخر الزماں کو امی کے لقب اور صفت نسبتی سے خطاب کیا۔ شاہ عزیز الکلام نے اردو کے قدیم و جدید شعراء کو امی بازیافت میں اصلاحاً "امی قرار دیا ہے جو اپنے موضوع کی سمت ایک بڑی تحقیقی جست ہے معلقات کے تمام عرب شعراء اس فلسفے سے عاری تھے حتیٰ کہ بعض جاہل شعراء تو ردیف قافیے کے روایتی اصولوں کی پروا بھی نہیں کرتے تھے ان میں سے کسی نے لکھنا پڑھنا تو درکنار، دستخط کرنے کی ضرورت بھی گوارا نہ کی تھی شاید مکہ کے قدیم باشندے لکھنے پڑھنے کو فعل عبث یا معیوب خیال کرتے تھے۔

اس کتاب کا یہ پہلو نہایت امید افزاء ہے کہ مصنف نے تاریخ اردو شاعری کے ایک تحقیقی و نایاب پہلو کی نشاندہی ہی نہیں بلکہ بڑے میدان تحقیق کا دروازہ وا کیا ہے۔ محققین کو اگر فطری میلانات اور بنیادی سوتوں کی بازیافت مطلوب ہو تو "اردو کے امی شعراء" کے ذریعہ اس موضوع پر انہیں بھرپور رہنمائی حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی

پاکستان میں ترتیب و تدوین کے کام کو تیسرے درجے کی تحقیق بھی نہیں سمجھا جاتا اور اسے اہمیت بھی نہیں دی جاتی حالانکہ اس کے معترضین ضرورت پڑنے پر اس کام کی تلاش کرکے اس سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ترتیب و تدوین کا یہ کام وقت طلب بھی ہے اور محنت کا متقاضی بھی۔ اس لئے کہ اس کے لئے قدیم مواد، رسائل اور اخبارات اور کتب کو کھنگالنا پڑتا ہے تب جاکر ڈھنگ کی کوئی چیز سامنے آتی ہے لہٰذا موجود میں البتہ اس کی اہمیت اور افادیت بڑھتی جارہی ہے کہ اس کے تناظر میں محققین کا کام آسان ہو جاتا ہے اس حوالے سے شاہ عزیز الکلام کی کتاب "اردو کے امی شعراء" ایک ایسی دستاویز ہے جسے ترتیب دینے اور مستند حوالے تلاش کرنے کیلئے سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا گیا ہے تب جاکر گوہر مقصود ہاتھ آیا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے جہاں منفرد ہے وہاں دلچسپ بھی ہے اور اس میں شامل ایک سو اکیاون شعراء کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہے وہ شاہ عزیز الکلام کی محنت اور لگن کی عکاسی کرتی ہیں۔ مجھے اس بات کا قوی اندازہ ہے کہ مواد تک رسائی کیلئے شاہ عزیز الکلام کو کتنے ہفت خواں طے کرنا پڑے ہوں گے اور کتنے ہی مراحلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ شاہ عزیز الکلام کی یہ منفرد، دلچسپ اور معلومات افزاء کتاب اس موضوع پر ہی نہیں اردو شاعری پر کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیگی۔

ڈاکٹر حنیف فوق

شاہ عزیز الکلام کی محنت اور تلاش تو ان کی کتاب "اردو کے امی شعراء" سے بخوبی نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ بڑے حوصلے کے آدمی بھی ہیں۔ وہ ہرگز اس بات سے تشویش میں مبتلا نہیں ہوتے کہ پہلے ان کی کتاب کا نام ہی حیرت انگیز بن جائیگا ان کی کتاب جو ۱۸۴۷ء تا ۱۹۹۳ء کا احاطہ کرتے ہوئے ۱۲۲ شاعروں (جن میں شاعرات بھی شامل ہیں) کے حالات اور نمونہ ہائے کلام پر مشتمل ہے اپنی بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے بڑی دلچسپ ہے۔ واقعات کے بیان میں کہیں کہیں تو افسانے کی سی جاذبیت پیدا ہو گئی ہے بنیادی طور پر اسے مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے اس کتاب کا چونکا دینے والا پہلو یہی ہے کہ اس میں جہاں حقیقتاً "ان پڑھ اور ناخواندہ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کے پہلو بہ پہلو ایسے شعراء بھی موجود ہیں جو خود صاحب کتاب کے الفاظ میں

باضابطہ روزگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اردو کے مروجہ معنوں کے علاوہ ایک ترکی عربی ثقافت سے ناواقف کو بھی کہا جاتا "امی کہا گیا ہے۔ شاہ عزیز الکلام نے امی کے معنوں میں وسعت دی ہے اور ان شعراء کو بھی اس زمرے میں شامل کیا ہے جنہوں نے کسی درسگاہ سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی یا جو کسی وجہ سے تعلیم کی تکمیل نہیں کر سکے بہرکیف شاہ عزیز الکلام کی موجودہ کتاب ہمارے لئے معلومات کا قابل قدر سرمایہ فراہم کرتا ہے کوئی تحریر و تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اردو کے "امی شعراء" سے ادبی مطالعہ کی کئی سمتیں روشن ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

"اردو کے امی شعراء" شاہ عزیز الکلام کا وہ تذکرہ ہے جس میں انہوں نے ایسے معروف شعراء کو جمع کیا ہے جو "کسی درسگاہ سے فارغ التحصیل نہیں تھے اور اپنی ذہانت، موزونی طبع اور ماحول کی وجہ سے فکر سخن کرتے تھے"۔ ان شعراء کو انہوں نے "امی" کے لفظ سے موسوم کیا ہے۔

یہاں بعض شعراء کے سلسلے میں دو رائے ہو سکتی ہیں لیکن یہ ایک ایسا اچھوتا موضوع ہے جس پر بہت کم مواد دستیاب ہے۔

شاہ عزیز الکلام نے اردو شاعری کے متعدد تذکرے چھان کر زیر نظر تذکرے میں ۱۴۰ امی شعراء کے حالات زندگی مع انتخاب کلام مرتب و شائع کئے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی یہ ایک دلچسپ اور اہم کام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اہل علم و ادب نہ صرف اس کتاب کی پذیرائی کریں گے بلکہ اپنی تحسین و تعریف سے عزیز الکلام صاحب کی حوصلہ افزائی بھی کریں گے جس کے وہ مستحق ہیں۔

ڈاکٹر شان الحق حقی

شاہ عزیز الکلام ان ہستیوں میں سے ہیں جنہیں ہمیشہ تعلیمی اور فلاحی کاموں کی لگن رہتی ہے۔ موصوف کو ادب سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ وہ شاعر تو نہیں البتہ شعر و شاعری سے دلچسپی مسلم ہے تحریر میں سلاست کے ساتھ ادبیت ہے۔ اس کے ساتھ تحقیق کا بھی ذوق رکھتے ہیں جس کا ثبوت ان کی مرتب کردہ "اردو کے امی شعراء" ہے۔ لوگ فہرست میں ایسے نام دیکھ کر ضرور چونکیں گے جو استاد الاساتذہ جانے جاتے ہیں۔

اس وقت میرا خیال اردو کی ایک جواں مرگ شاعرہ زخ ش کی طرف جاتا ہے جن کا اصل نام زاہدہ خاتون شروانیہ تھا ان کی زندگی میں بھی ان مبہم حروف کا پردہ پڑا رہا لوگ یہ نہ جان سکے کہ یہ کسی عورت کا نام یا کلام ہے۔ مرنے کے بعد دنیا اس نام سے اتنی ہی ناواقف ہے جتنی کے اکثر امی شعراء سے جن کو شاہ صاحب نے زندگی بخشنے کی کوشش کی ہے۔ زخ ش نے صرف ۲۷ سال کی عمر پائی اور ناکتخدا رہیں۔ موصوفہ کا کلام "فردوس تخیل" ان کی وفات کے ۱۷ سال بعد یعنی ۱۹۳۰ء میں ادھورا شائع ہوا یعنی صرف نظمیں۔ یہ اردو فارسی عربی پر دستگاہ کے علاوہ حالات زمانہ سے باخبری اور ترقی پسندانہ روش کا شاہد ہے۔ وہ اردو کی پہلی ترقی پسند شاعرہ تھیں جنہوں نے عالم اسلام کے سانحات اور جدوجہد آزادی کے ساتھ ساتھ مزدور اور کسان پر جتنی دلسوزی سے نظمیں لکھیں جبکہ ترقی پسند تحریک کا ابھی نام بھی نہ سنا گیا تھا۔ وہ پردے میں پلیں، کسی درسگاہ کا منہ نہیں دیکھا اور پوری طرح شاہ عزیز الکلام کے اختیار کردہ لقب امی کی تعریف میں آتی ہیں۔

تابش دہلوی

"اردو کے امی شعراء" جناب شاہ عزیز الکلام کا مرتب کردہ تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں ایسے شعراء کا ذکر ہے جن میں سے بعض بالکل ان پڑھ اور بعض اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ ہرچند امی کے معنی ان پڑھ کے ہیں لیکن اس تذکرے میں اس لفظ کو وسیع تر معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے وہ شعراء بھی مراد ہیں جو اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔

شاہ عزیز الکلام نے اس تذکرے کو مرتب کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری تہذیب جو اسلامی ہندی تہذیب ہے۔ اس عروج پر تھی کہ اس میں ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ لوگ بھی شعر و ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور ان سے شعر و ادب کے ایسے نادر نمونے ظہور پذیر ہوئے

ہیں جو آج بھی ہمارے ادبی سرمایہ کا قیمتی حصہ ہیں اور تاریخ ادب ان کے کارناموں پر ہمیشہ فخر کرتی رہے گی اور شاعری کا یہ سرمایہ جو ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ شعراء سے وجود میں آیا ہے خود ان شعراء کے لئے بھی فخر و مباہات کا باعث ہے کہ انہوں نے اپنی کم علمی کے باوجود ایسی عمدہ شاعری کی ہے۔

اس کتاب کے مرتب کرنے میں شاہ صاحب نے بڑی محنت کی ہے اور بعض ایسے شعراء کا کلام اور حالات بھی فراہم کئے ہیں جن کا کسی تذکرہ میں ذکر نہیں۔ پھر برصغیر کے تمام صوبوں کے امی یا کم تعلیم یافتہ شعراء اور شاعرات کا تذکرہ اور کلام بھی شامل ہے۔ اس سے اس تذکرہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں تقریباً" ایک سو بیس شعراء کا ذکر ہے یہ کتاب اس لحاظ سے بالکل منفرد ہے اور جامعات کے طالب علموں کے لئے نہایت مفید مواد فراہم کرتی ہے۔ شاہ عزیز الکلام مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بالکل انوکھے انداز میں شعراء کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس کتاب سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ شاہ صاحب اس تہذیب سے کس قدر متاثر ہیں جس تہذیب کے وہ خود علم ہیں یقین ہے کہ یہ کتاب اہل ذوق سے قبول عام کی سند ضرور حاصل کرے گی۔

سید محمد تقی

جناب شاہ عزیز الکلام نے ایک غیر معمولی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے اردو کے امی شعراء۔ دنیا کے ادب میں لکھنے والوں نے بہت سی اچھی کتابیں پیش کی ہیں۔ لیکن ایسی کتابیں غالباً" بہت کم لکھی گئی ہیں جن کی تحریر میں محنت شاقہ کا اتنا استعمال کیا گیا ہو جتنا شاہ عزیز الکلام کی " اردو کے امی شعراء " میں دیکھنے میں آیا جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے ایک مشکل عنوان اپنے خیالات کے اظہار کیلئے چنا ہے۔ امی شعراء پر ایک ایسی کتاب لکھنا جس میں ان کا کلام اور ان کی زندگی کے بارے میں مختصر مگر اہم معلومات موجود ہو بڑا مشکل کام ہے۔ امی شعراء کا کلام معروف ذرائع ابلاغ کے دسترس میں بمشکل ہی آتا ہے اس لئے کہ ان کے خیالات تک ذرائع ابلاغ سے متعلق حضرات کا پہنچنا مشکل ہے کہ وہ اس سمت میں بمشکل ہی تیار ہوتے ہیں شاہ صاحب نے اس مشکل پر قابو حاصل کیا ہے اور اپنی جان جوکھوں ڈال کر ان کے حالات اور ان کے کلام کے نمونوں کو بڑے غیر معمولی حالات سے گزر کر حاصل کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں عام یقین یہ ہے کہ امی حضرات ادب و شعر تخلیق نہیں کر سکتے حالانکہ دنیا کی سب سے بڑی کتاب امی حضرات نے لکھی ہیں اب مثلاً قرآن مجید کو لیجئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ہمیں ملا ہے اور آنحضرت کے امی ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کا معجزہ ہونا جس اساس پر مانا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن جس شخص نے پیش کیا وہ واضح طور پر امی تھے۔ یاد رہے کہ خود قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر قوم یاد کہ ہر قوم کیلئے ایک ہادی مقرر کیا گیا ہے یہ بھی یاد رہے کہ وہ کتابیں جنہیں الوہی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے ان کی تصدیق خود قرآن مجید میں موجود ہے ان میں سے کسی ایک کتاب میں یہ دعویٰ موجود نہیں ہے کہ وہ خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ امی شعراء دراصل ان شعراء کو کہتے ہیں کہ جو (Untutored) ہوں یعنی جن کے استاد موجود نہ ہوں۔ مطلب اس کا یہ کہ ان کا کلام جن کے استاد موجود نہ ہوں اس معیار پر پورا اترتا ہو کہ وہ شاعر کہلا سکے اور شاعری کیلئے کم سے کم موزوں طبع ہونا تو ضروری ہے جس کا ثبوت خود اس امی شعراء کے کلام سے مہیا ہوتا ہے لیکن اس کتب کے لکھنے میں مصنف کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا وہ ظاہر ہے اس لئے کہ ان شعراء میں بھی ایسے شعراء شامل ہیں جو خاص طور پر سب سے نچلے درجہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس لئے اگر ان کی رسائی ذرائع ابلاغ تک نہ ہو یا ذرائع ابلاغ کی رسائی ان تک نہ ہو تو پھر کلام کو جمع کرنا ایک بڑا مشکل کام ہے مصنف بھی قابل داد ہیں کہ انہوں نے اس مشکل کو سر کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی جو شاہ صاحب نے واقعی امی جذبے والے اور شوق کا مظاہرہ کیا ہے جس کا اظہار بھی

لگا اسی کیلئے مقابلہ لکھنے والوں کی کتابوں میں نظر
آتا ہے ویسے تو اس زمانہ میں جبکہ ہمارے
معاشرے میں عام طور پر کتابیں مطالعہ کرنے
والے خال خال رہ گئے ہیں ایک بیحد قابل قدر
کام ہے اور مصنف قابل داد ہیں کہ انہوں نے
ایک انتہائی مشکل مضمون پر محنت کرکے ایک اہم
کتاب مرتب کی جس کی داد دی جانی ضروری
ہے۔

سید حسن مثنیٰ ندوی

شعراء کے تذکرے تو بہت لکھے گئے لیکن شاہ
عزیز الکلام نے تذکرے کا یہ ایک الگ پہلو نکال
لیا کہ اردو کے ان شاعروں و شاعرات کا تذکرہ
لکھا کرتا جن کو حالات نے رسمی تعلیم حاصل
کرنے سے یکسر محروم رکھا یا کسی درسگاہ میں داخل
بھی ہوئے تو اس سے پوری طرح فیضیاب ہونے کا
موقع ان کو نہیں ملا۔ مجموعہ میں متعدد نام ایسے
بھی مذکور ہیں جن کو دیکھ کر لوگ چونک پڑیں گے
لیکن کیا کیجئے کہ شاہ صاحب کی جستجو کا حاصل یہی
ہے۔

اس تذکرے میں مختلف باتوں کی جانب توجہ
کرنے کا موقع سب کو دیا ہے اس میں جن مردوں
و عورتوں کے نام آئے ہیں ان کو بنانے سنوارنے
میں علم و فن کی فضاء کا بڑا دخل تھا۔ اس ماحول
میں علم و فن کے حامل افراد موجود تھے۔ ان کی
مجلسیں تھیں، محفلیں تھیں، مشاعرے تھے جن کے
اثر سے فکر و خیال کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی۔
اکثر لوگ امی کے معنی لکھتے ہیں لیکن ایسا نہیں
ہے یہ معنی مشرکین مکہ کے نزدیک بھی نہیں تھے
امی لقب ہے حضور اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا۔ یہ لقب قرآن مجید میں مذکور ہے
(سورۃ اعراف ۱۵۷)۔ امی کے معنی ناخواندہ اور
بلکہ کافر و بت پرست
(Pagan and Heathen) بھی۔
یہودیوں نے اپنی ڈکشنری میں مقرر کئے تھے کہ امی
وہ لوگ ہیں جو اسرائیلی نہیں ہیں اور امی کے معنی
کافر و بے دین کے ہیں۔ دیکھئے
Torrey Jewish Foundation
of Islam

امی واحد امیین جمع' محمد الرسول النبی الامی وہ
لقب ہے۔ غیب کی خبر دینے والا (لغت مرتجم) جو
اسماعیل کے گھرانے کا (برگزیدہ) فرزند۔ ام القریٰ
(یعنی مکہ) کا رہنے والا' لغت کی کتابوں امی کے
معنوں میں ناخواندہ بھی لکھ دیا گیا ہے مگر عربی زبان
کے بڑے لغات میں ام اور امت کی طرف منسوب
ہو کر یہ لفظ آیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اپنے
اصلی صدور نہیں ہے بلکہ مصنوعی ہے' بنایا ہوا۔
دیکھئے معجم الوسیط قاہرہ) عربوں کو لفظ امی کے
ترجمے کی ضرورت نہیں تھی غیر عربوں کو ترجمے کی
ضرورت تھی۔

اظہر حسن صدیقی

شاہ عزیز الکلام صاحب واقعی نہ صرف
ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں بلکہ اہل علم کے
شکریے کے بھی کہ انہوں نے ایک ایسا مشکل اور
عرق ریزی کا کام سرانجام دیا ہے کہ جس کی طرف
عام طور پر محققین نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔
غالباً اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ایسے شعراء
کرام کے حالات و واقعات اور خاص طور پر ان
کے کلام کے متعلق معلومات حاصل کرنا بہت مشکل
کام تھا اور پھر وہ بھی ایک دو نہیں سو سے زیادہ
ایک مخصوص طبقہ سے تعلق رکھنے والے شعراء
کرام کے حالات اور ان کے کلام کی تفصیلات
جن میں سے اکثر کے تو اسماء گرامی بھی پہلی دفعہ
معلوم ہوتے ہیں۔

اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے اکثر شعراء
کے ساتھ یہ مجبوری ہوتی ہے کہ اپنی کم مائیگی کی
وجہ سے ان کا نہ تو کوئی اپنا حلقہ ہوتا ہے اور نہ
وہ کسی انجمن یا ادبی تنظیم کے ممبر ہوتے ہیں اس
لئے نہ تو مشاعروں اور مختلف تقریبات میں بلائے
جاتے ہیں اور نہ ان کا دیوان ہی چھپتا ہے۔
دیوان چھپنا تو بہت بڑی بات ہے اکثر اخبار اور
ادبی رسالے بھی یہ زحمت گوارا کرنے کیلئے تیار
نہیں ہوتے ہیں اور یہ بیچارے مع اپنے کلام
بالآخر گمنامی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ شاہ صاحب یہ تحقیق اور
جستجو کا کام جاری رکھیں گے اللہ تعالیٰ انہیں مزید
توفیق اور ہمت عطا فرمائے آمین!

عبیداللہ بیگ

میں اپنی علمی بے بضاعتی کے سبب شاہ صاحب کی اس جلیل القدر کاوش کی تعریف کا حق ادا کرنے کے قابل نہیں، لیکن پھر بھی اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ موصوف نے امی شعراء کے حالات یکجا کر کے اردو ادب اور بالخصوص شعری ادب کے طلباء و محققین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ آپ نے سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کیلئے جتنی محنت کی ہے وہ اس کتاب سے ظاہر ہے۔ بیان کا انداز سادہ ہونے کے ساتھ کلاسیکی لگتا ہے جو صاحب تصنیف کی علمی استعداد کا ثبوت ہے۔

اس تذکرے کے مطالعہ سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تخلیقی صلاحیت کتب و مدرسہ میں حصول علم کی باقاعدگی سے نہیں حاصل ہوتی۔ یہ صلاحیت خداداد ہوتی ہے، جس کو چاہے خدا بخش دے۔

نگار زمن

"اردو کے امی شعراء" شائع کر کے شاہ عزیز الکلام نے ایک ایسا کام کیا ہے جس سے نہ صرف ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم خلاء پر ہو گیا ہے بلکہ اردو زبان کی اہمیت بھی اجاگر ہو گئی ہے۔ یہ زبان نہ صرف پیغام رسانی کا ذریعہ ہے بلکہ ایک پورے کلچر کی نمائندگی کرتی ہے۔ بعض لوگ لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں مگر لکھے پڑھے لوگوں کی صحبت میں رہنے سے ان کی طبیعت پر جلا ہو گئی اور شعر کہنے لگے جو بڑی عجیب اور دلچسپ بات ہے اور ایک طرح سے اردو زبان کا امتیاز بھی ہے۔ اردو زبان میں بڑی خوبیاں ہیں مثلاً ریختی کا ترقی یافتہ زبانوں میں بھی پتہ نہیں لگتا۔ لیکن اردو میں وہ بھی موجود ہے اسی طرح امی شعراء کا تذکرہ کہیں اور شاید ہی ہو مگر ہمارے یہاں پایا جاتا ہے۔

پروفیسر ابوالخیر کشفی

شاہ عزیز الکلام صاحب اردو کے معروف ادیب اور صحافی ہیں۔ انہوں نے "اردو کے امی شعراء" کی ترتیب و تالیف کے ذریعے تذکرہ نویسی کی روایت کو ہمارے دور میں آگے بڑھایا ہے۔ ویسے ہمارے زمانے میں شعراء کے کئی تذکرے لکھے گئے ہیں اور نئے عنوانوں سے مثلاً نعت گو شعراء کے تذکرے یا کسی خاص علاقے اور شہر کے شعراء و ادباء کے تذکرے۔

جناب عزیز الکلام صاحب کا تذکرہ قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے کیونکہ اس کے نام میں بڑی ندرت ہے۔ اس تذکرے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ برصغیر جنوبی ایشیا کی زبانوں میں اردو کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے شعروسخن کے حلقے میں ہر علمی اور حیثیت کے لوگ نظر آتے ہیں ان میں ان پڑھ، ناخواندہ اور نیم خواندہ افراد بھی شامل ہیں۔ بہت سے شعراء کے تخلص ہی ان کے امی ہونے کی شہادت دیتے ہیں مثلاً امی دہلوی، ان پڑھ امروہوی، انگشت، ٹیڑا، ایک چند وغیرہ۔ راقم الحروف بھی ایسے شعراء سے واقف ہے جو اپنا کلام خود نہیں لکھ سکتے تھے بلکہ دوسروں سے لکھواتے تھے یعنی وہ املا کراتے تھے مثلاً کانپور کے دو شعراء جناب گلاب اور جناب تسنیم کانپوری۔

بہرحال شاہ عزیز الکلام صاحب نے دلچسپ اور مزے کا تذکرہ مرتب کیا ہے اور یقیناً اس سے لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔ ان میں سے کئی شاعر درجہ استاد رکھتے ہیں اور بہت سے شاعر مشہور تو ہیں لیکن ان کے حالات زندگی سے ہم جیسے لوگ ناواقف تھے اور ان کا نمونہ کلام بھی آسانی سے نہیں ملتا ہے۔ شاہ صاحب نے ان کے نام اور کلام کو اپنے اس تذکرے کے ذریعے محفوظ کر دیا ہے۔

اردو کے اُمّی شعراء

(۱۷۸۲ء تا ۱۹۸۲ء)

تحقیق و تحریر

شاہ عزیز الکلام

اردو اکیڈمی پاکستان
کراچی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

سرورق : ——— شمیم احمد باذل

دوسرا ایڈیشن ——— ۲۰۰۱ء

قیمت : ——— ۲۰۰ [redacted] روپے

طباعت : القائد پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر :- ——— اردو اکیڈمی، پاکستان

۱۰۰- النور چیمبر، پریڈی اسٹریٹ

پوسٹ بکس نمبر ۷۷۰۴، کراچی ۷۴۴۰۰

تقسیم کنندگان :-

(۱) مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی ۱

(۲) پنجاب بک ڈپو، اردو بازار کراچی ۱

(۳) ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ کراچی

(۴) بزم علم و فن :- ۱۱۔ شان پلازہ، بلیو ایریا۔ اسلام آباد

(۵) ہندوستان میں کتاب ملنے کا پتہ :-

ڈاکٹر طیبہ خاتون۔ ۲۴۱ گلی گڑھیا جامع مسجد دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

اِنتساب

میں اِس تالیف کو نئی نسل کے نام معنون کرتا ہوں۔
اس میں لاکھ خرابیاں سہی مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ
نئی نسل آرزوئے پرواز سے محروم نہیں۔ ملک وملت
کی بہتری کی تمام توقعات اسی سے وابستہ ہیں۔ مجھے
قوی اُمید ہے کہ نئی نسل اپنے تہذیبی وثقافتی ورثے
کو محفوظ کرنے اور ترقی دینے میں کوتاہی نہیں کرے گی۔

شاہ عزیز الکلام

maablib.org

ترتیب

۱۔	انتساب	۳
۲۔	پیش لفظ	۷
۳۔	مقدمہ	۱۳
	فہرست شعراء	
۴۔	آسی دہلوی	۱۸
۵۔	آتر پڑھ امروہوی	۲۰
۶۔	اکبر وارثی	۲۴
۷۔	اوگھٹ بچھرایونی	۲۷
۸۔	آفگر مرادآبادی	۳۰
۹۔	اسیر دہلوی	۳۲
۱۰۔	امیر دہلوی	۳۴
۱۱۔	احسان دانش	۳۵
۱۲۔	آتش دہلوی	۴۲
۱۳۔	اصغر گونڈوی	۴۵
۱۴۔	بشیر مرادآبادی	۴۹
۱۵۔	بے تاب دہلوی	۵۲
۱۶۔	برہم میرٹھی	۵۴
۱۷۔	برگشتہ لکھنوی	۵۶
۱۸۔	بینا بہاری	۵۸
۱۹۔	بیتو دہلوی	۵۹
۲۰۔	بہتر رائے بریلوی	۶۱
۲۱۔	بیخود دہلوی	۶۴
۲۲۔	پیرا دہلوی	۶۹
۲۳۔	پیک دہلوی	۷۰
۲۴۔	پارسا جیسوری	۷۱
۲۵۔	پتنفر دہلوی	۷۲
۲۶۔	تحیر دہلوی	۷۳
۲۷۔	تصویر دہلوی	۷۴
۲۸۔	تنہا دہلوی	۷۶
۲۹۔	تمیز رامپوری	۷۷
۳۰۔	تسنیم رائے بریلوی	۷۹
۳۱۔	تاباں دہلوی	۸۱
۳۲۔	ٹیو جے پوری	۸۴
۳۳۔	ثبات مظفر نگری	۸۵
۳۴۔	ثابت ملتانی	۸۶
۳۵۔	جرات دہلوی	۸۸
۳۶۔	جراح دہلوی	۹۲
۳۷۔	جوش دہلوی	۹۳
۳۸۔	جلیل کمال پشاوری	۹۴
۳۹۔	جگر مرادآبادی	۹۶

۴۰ ۔	چمن دہلوی	۹۹
۴۱ ۔	چلبل گجراتی	۱۰۰
۴۲ ۔	چھتر بھوپالی	۱۰۲
۴۳ ۔	حاتم دہلوی	۱۰۴
۴۴ ۔	ہوشیار میرٹھی	۱۰۷
۴۵ ۔	حسامی دہلوی	۱۰۹
۴۶ ۔	حجام دہلوی	۱۱۲
۴۷ ۔	ہدہد بہاری	۱۱۴
۴۸ ۔	حقیر بریلوی	۱۱۵
۴۹ ۔	حسین لکھنوی	۱۱۷
۵۰ ۔	خسر بنارسی	۱۲۱
۵۱ ۔	حفیظ جالندھری	۱۲۵
۵۲ ۔	خمیر دہلوی	۱۳۰
۵۳ ۔	خضر دہلوی	۱۳۲
۵۴ ۔	خلیفہ دہلوی	۱۳۳
۵۵ ۔	خالص بھوپالی	۱۳۴
۵۶ ۔	دوست سرحدی	۱۳۵
۵۷ ۔	دل علیگڑھی	۱۳۶
۵۸ ۔	دستگیر اکبر آبادی	۱۳۷
۵۹ ۔	ڈھینڈس بھوپالی	۱۳۹
۶۰ ۔	ذہین بجنوری	۱۴۱
۶۱ ۔	ذرہ اکبر آبادی	۱۴۲
۶۲ ۔	ذوق رامپوری	۱۴۲
۶۳ ۔	روشن دہلوی	۱۴۳
۶۴ ۔	رسا دہلوی	۱۴۵
۶۵ ۔	رند دہلوی	۱۴۷
۶۶ ۔	رمز دہلوی	۱۴۸
۶۷ ۔	روشن دہلوی	۱۵۱
۶۸ ۔	رسوا دہلوی	۱۵۳
۶۹ ۔	رنگین دہلوی	۱۵۵
۷۰ ۔	رونق دہلوی	۱۵۷
۷۱ ۔	رضا سلطانپوری	۱۶۱
۷۲ ۔	رزمی شاہجہانپوری	۱۶۴
۷۳ ۔	زیبا شاہجہاں آبادی	۱۶۶
۷۴ ۔	زر لاہوری	۱۶۷
۷۵ ۔	زار لکھنوی	۱۶۸
۷۶ ۔	سچل سرمست	۱۶۹
۷۷ ۔	سردار لکھنوی	۱۷۱
۷۸ ۔	سکندر دہلوی	۱۷۲
۷۹ ۔	سر سبز	۱۷۳
۸۰ ۔	سلیم کٹھولوی	۱۷۴
۸۱ ۔	سود مدراسی	۱۷۵
۸۲ ۔	ساحر مصطفائی	۱۷۶
۸۳ ۔	ساجد سرحدی	۱۷۹
۸۴ ۔	شفیق لکھنوی	۱۸۱
۸۵ ۔	شفق دہلوی	۱۸۴

۸۶۔ شاکر اعظمی ۱۸۵
۸۷۔ شمیم لاجپوری ۱۸۶
۸۸۔ شور فراشیسی ۱۸۷
۸۹۔ صنم اکبرآبادی ۱۹۰
۹۰۔ صفیہ مرادآبادی ۱۹۱
۹۱۔ صہبا اکبرآبادی ۱۹۲
۹۲۔ ضیا لکھنوی ۱۹۴
۹۳۔ طالب لکھنوی ۱۹۶
۹۴۔ عاجز بھوپالی ۱۹۸
۹۵۔ عاشق بھوپالی ۱۹۹
۹۶۔ عمر علیگڑھی ۲۰۱
۹۷۔ عرش لکھنوی ۲۰۲
۹۸۔ عظیم لکھنوی ۲۰۵
۹۹۔ علی سندھی ۲۰۶
۱۰۰۔ فاضل امروہوی ۲۰۷
۱۰۱۔ فنی بنارسی ۲۰۸
۱۰۲۔ قدر جے پوری ۲۱۰
۱۰۳۔ قمر جلالوی ۲۱۱
۱۰۴۔ کیف بھوپالی ۲۱۴
۱۰۵۔ کرم تالپور ۲۱۶
۱۰۶۔ کلیم جالیسری ۲۱۷
۱۰۷۔ گوہر گورکھپوری ۲۲۱
۱۰۸۔ ماہر دہلوی ۲۲۲
۱۰۹۔ منور سنبھلی ۲۲۷
۱۱۰۔ مضطر رامپوری ۲۲۹
۱۱۱۔ میراجی ۲۳۰
۱۱۲۔ منیر دہلوی ۲۳۳
۱۱۳۔ مکیش غازیپوری ۲۳۴
۱۱۴۔ نصیر دہلوی ۲۳۷
۱۱۵۔ نظام رامپوری ۲۴۱
۱۱۶۔ نیرنگ کاکوروی ۲۴۳
۱۱۷۔ نفیس بھوپالی ۲۴۶
۱۱۸۔ وفا سہسرامی ۲۴۸
۱۱۹۔ وحشت ملتانی ۲۴۹
۱۲۰۔ یک رنگ دہلوی ۲۵۰
۱۲۱۔ یکتا لکھنوی ۲۵۱
۱۲۲۔ یقین دہلوی ۲۵۲
۱۲۳۔ کتابیات ۲۵۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مجھے اردو کے اُمّی شعراء پر لکھنے کا خیال کیوں اور کیسے آیا؟ اس کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ تقریباً پچاس ۵۰ سال پیشتر میں نے اُردو کے کسی رسالے میں "اَن پڑھ شعراء" پر مضمون پڑھا تھا۔ رسالے اور مضمون نگار کا نام تو مجھے یاد نہیں رہا، البتہ نفسِ مضمون ذہن میں برابر محفوظ رہا بلکہ اس تمام مدّت میں حرزِ جاں بنا رہا۔ میں اس وقت دسویں جماعت میں پڑھتا تھا، اردو زبان و ادب، خاص کر اُردو شاعری کے متعلق میری معلومات بس واجبی سی تھی، البتہ دِلّی کے شاعرانہ ماحول اور علمی مذہبی گھرانے میں آنکھیں کھولنے کے باعث شعر و سخن سے دلچسپی بچپن ہی میں پیدا ہو چکی تھی جو وقت کے ساتھ برابر بڑھتی رہی اور بالآخر اس تصنیف کی محرک بنی۔

برصغیر میں انگریزی عملداری کے بعد دِلّی جو کبھی شعر و سخن کا گہوارہ تھی - اگرچہ اب اجڑ چکی تھی تاہم اس کے گلی کوچوں میں اب بھی ایسے بڑے بوڑھے بقیدِ حیات تھے جو زیورِ علم سے آراستہ نہ ہونے کے باوجود اپنی ذہانت، شوق اور موزونیِ طبع کے باعث فکرِ سخن کرتے تھے اور بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کر کے خوب خوب دادِ تحسین حاصل کرتے تھے۔

مجھے ایسے اُمّی و کم سواد شعراء کو دیکھنے اور سننے کے کئی موقعے ملے ہیں جو باوجود اپنی بے علمی اور کم مائیگی کے شعر گوئی پر پوری قدرت رکھتے تھے اور مشاعروں میں جن کا کلام سُن کر بڑے بڑے استادوں کے سر ہل جاتے تھے۔ مجھے اس طویل مدت میں کئی بار یہ خیال آیا کہ اگر ان اُمّی شعراء کے کلام کو محفوظ نہیں کیا گیا تو اس

بات کا قوی امکان ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ قیمتی ادبی سرمایہ ضائع ہو جائے گا اور آنے والی نسل شعر و ادب کے اس دل پذیر پہلو سے ناواقف رہ جائے گی۔ لہٰذا میں نے ایسے شعراء کا جنھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی یا کسی وجہ سے تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے، تعارف کرانے اور ان کی خوبیٔ کلام کو منظرِ عام پر لانے کے لیے "اردو کے اُمّی شعراء" کے عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس موضوع پر کام شروع کرنے سے قبل مجھے راہ میں حائل دشواریوں کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ جن شعراء پر یہ مقالہ تحریر کرنے کا ارادہ تھا، دریں اثنا ان میں سے بیشتر سفرِ آخرت اختیار کر گئے اور نہ وہ لوگ ہی باقی بچے جو اُن سے رسم و راہ رکھتے تھے۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

دوسری مشکل یہ پیش آئی کہ اس موضوع پر ضروری مواد تحریری شکل میں دست یاب نہیں ہوا۔ کہیں ملا بھی تو وہ ناکافی، غیر معتبر اور غیر مربوط تھا، لہٰذا معتبر اور مزید مواد کی تلاش میں مجھے در در جانا پڑا۔ ان شعراء کے عزیز و اقارب اور دوستوں کے دروازوں پر بار بار دستک دینی پڑی۔ یہاں تک کہ بعض جگہ ٹھوکریں بھی کھانی پڑیں۔

از پئے دیدنِ رخت، ہم چو صبا فتادہ ام
خانہ بہ خانہ، در بہ در، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ابتدا میں اس موضوع پر صرف ایک مقالہ سپردِ قلم کرنے کا ارادہ تھا لیکن اس طویل مدت میں جو مواد دستیاب ہوا وہ مقدار اور معیار کے لحاظ سے اتنا وافر اور وقیع تھا کہ اس کے لیے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ زیادہ سے زیادہ اُمّی اور کم سواد شعرا کا کلام محفوظ ہو جائے۔

مجوزہ کتاب کی بابت جب برصغیر ہند و پاکستان کے ممتاز اساتذۂ سخن و اصحابِ علم و فن سے رجوع کیا گیا تو تقریباً ہر ایک نے اردو کے اُمّی شعراء پر

لکھنے کے اس خیال کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ،

"جہاں تک یاد پڑتا ہے اس موضوع پر ابھی تک تحقیقی کام نہیں ہوا۔ موضوع بہت دلچسپ، وسیع اور مشکل ہے، اگر ہمت کر کے یہ کام کر لوگے تو بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی" ان ممتاز اصحاب شعر و ادب کی ہمت افزائی نے بلا شبہ سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا اور اس طرح میں اس کام کی تکمیل میں مشغول ہو گیا۔ مقتدر اصحاب علم و فن سے ملاقاتوں کے علاوہ اردو کے معروف تذکروں، سوانح و ادبی رسائل کو کھنگالنا پڑا۔ موضوع زیرِ بحث پر جہاں سے بھی کوئی شے دستیاب ہوئی اسے ناظرین کی دعوتِ طبع کے لیے محفوظ کر لیا ؎

یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

موضوع پر تحقیق کے دوران یہ بات علم میں آئی کہ قیامِ پاکستان سے کوئی پچیس ۲۵ برس قبل خنجر لکھنوی کا ایک مضمون "ان پڑھ شعراء" کے عنوان سے "اردو سہ ماہی" میں چھپا تھا۔ اس وقت سے اب تک یہی ایک مضمون جوں کا توں وقتاً فوقتاً چھپتا چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ صاحبِ مضمون نے خود کو زیادہ تر دلی و لکھنؤ کے دبستانوں تک ہی محدود رکھا تاہم اردو کے ان دو اہم مرکزوں کی بیشتر کڑیاں ناگفتہ رہ گئیں۔ یہی وجہ ہے جس نے مجھے اس موضوع پہ یہ مقالہ تحریر کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ بڑا مشکل اور نازک کام تھا خصوصاً اس دور میں جب کہ ہر میدان میں قحط الرجال ہے۔ اگر تائیدِ ایزدی شاملِ حال نہ ہوتی تو اتنے بڑے کام کی تکمیل میرے بس کی بات نہ تھی ؎

از دست و زبان کہ بر آید
کز عہدۂ شکرش بدر آید

مواد کی تلاش و تحقیق کے لیے مجھے جو پاپڑ بیلنے پڑے اس کا ذکر ایک طویل داستان ہے۔ اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں خود ان منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔۔۔ بہر کیف اس کام کو اب سے بہت پہلے مکمل ہو جانا چاہیے تھا، مگر ماحول کی ناسازگاری

ضروری مواد کی کم یابی، اپنی نارسائی، اور سب سے بڑھ کر اس موضوع پر لکھنے میں تامّل اب تک اس کام کی تکمیل میں حائل رہے۔ سخت مشکلات اور بے شمار آزمائشوں کے بعد اس موضوع پر حاصل کردہ معلومات کو اس کتاب کی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔ اردو کے اُمّی و کم سواد شعرا کو روشناس کرانے کی میری یہ ادنیٰ کوشش ہے۔ امید ہے اس ناچیز کوشش سے دوسرے اہل قلم اس جانب بھی متوجہ ہوں گے۔ اور موضوعِ زیرِ بحث پر مزید اور بہتر کام کرنا ممکن ہوگا۔

تا نہال دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

یہ کتاب جن مقتضیات کی تحریک پر مرتب کی گئی ہے وہ اس کا موضوع ہے جو دبستانِ اُردو میں ایک دل پذیر تصوّر پیش کرتا ہے۔ قارئین کو کتاب میں شامل بعض ناموں کو پڑھ کر حیرانی ضرور ہوگی مگر حقیقت یہی ہے کہ اُردو کے یہ نابغۂ روزگار شعرا کسی درس گاہ سے فارغ التحصیل نہیں تھے۔ یہ محض اپنی ذہانت، موزونیٔ طبع اور ماحول کی وجہ سے فکرِ سخن کرتے تھے اور جن زمینوں میں قدم رکھتے تھے، ان کو بزورِ طبعِ خداداد سرانجام دیتے تھے۔ مدعیانِ کمال کی مجال نہ ہوتی کہ ان کے کلام میں کوئی نقص نکال سکیں۔

کتاب کی اشاعت سے میری مُراد اُن اُمّی شعرا کی تحقیر و تضحیک مقصود نہیں بلکہ اس سے میری مراد اٹھارویں صدی کی اُس سوسائٹی کی آئینہ داری مقصود ہے جسے اُردو شاعری کی تاریخ میں عہدِ زرّیں قرار دیا گیا ہے۔ اُس عہد میں شعر و شاعری کو ایک فن و ہنر سمجھا جاتا تھا۔ ہر کس و ناکس شعر گوئی کو قابلیت اور کسبِ معاش کا ذریعہ سمجھتا تھا اور اس میں ترقی کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سترھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک ہر مذہب و ملت کے افراد اردو شاعری کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں ایک اَن پڑھ یا کم سواد شخص کی زبان پر مصطلحاتِ علمی ایسی بے تکلفی سے رواں ہوتے تھے کہ ان کو سُن کر

کسی طرح یہ باور نہیں ہوتا تھا کہ یہ شخص اُمّی محض یا کم سواد ہے۔ شاعری کا یہ مذاق اس سوسائٹی کی وجہ سے تھا جو اَب ختم ہوتی جارہی ہے۔
اس کتاب میں شامل مواد کے متعلق چند گزارشات ضروری ہیں۔

۱۔ یہ تالیف اس موضوع پر ایک مقالہ تھا۔ اس میں اضافے کے بعد اردو شاعری کے ہر دور سے ایسے منفرد اُمّی و کم سواد شعراء کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جو رسمی علم سے بہرہ ور نہ تھے یا جن کی لیاقت معمولی سے زیادہ نہ تھی۔

۲۔ اس تالیف کو شعراء کے تخلص کے حروف تہجّی پر مرتب کیا گیا ہے لہٰذا تقدیم یا تاخیر کو کسی برتری یا کمتری کا معیار نہ سمجھا جائے۔

۳۔ کتاب میں جن شعراء کا انتخاب پیش کیا گیا ہے ان میں ایسے شعراء بھی ہیں جن کے متعلق اب تک معلومات حاصل نہیں تھیں یا تھیں تو بہت کم۔ تلاش کے بعد اس میں اضافہ کیا گیا ہے۔

۴۔ کتاب میں شامل شعراء کے کلام کے انتخاب میں صرف موزونیت اور شعریت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ متفرق اشعار کے علاوہ جہاں ممکن ہوا پوری کی پوری غزل بھی دی گئی ہے تاکہ شاعر کے مقام کا تعین کیا جاسکے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں اردو زبان کا محقق یا شاعر نہیں ہوں۔ البتہ اس کا ایک ادنیٰ خدمت گار ضرور ہوں۔ میں نے کتاب میں شامل بعض شعراء سے صرف واقفیت کی بناء پر محض ان شخصیتوں کی تصویر کشی کی ہے تاکہ آنے والی نسل اُردو شعر و ادب کی تاریخ کے اس دل پذیر پہلو سے ناواقف نہ رہ جائے ۔

فقیہہ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال
فقیر راہ نشیں است و دل غنی دارد

میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ کرنا ناظرین کے اختیار میں ہے۔ کتاب میں شامل مواد کی درستی کی پوری کوشش کی گئی ہے

پھر بھی اگر کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہو یا درست نہ ہو تو توجہ دلانے والے احباب کا تہہ دل سے ممنون ہوں گا کہ سہ کارے کسے تمام نکرد۔

کتاب کی اشاعت کے لیے پاکستان کے ممتاز اصحابِ علم و فن بالخصوص فرخ مرزا دہلوی، ملا واحدی، سید ولی اشرف صبوحی۔ رئیس امروہوی، پروفیسر شبیر حسین کاظمی، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر این اے بلوچ۔ مرزا ظفر الحسن۔ پروفیسر شوکت واسطی۔ پروفیسر عبدالرشید فاضل، ابوالفطرت میر زیدی، افسر صدیقی امروہوی، مہتاب ظفر توقیر صدیقی، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، نیاز حسین کیف بنارسی اور قریشی پور کے علاوہ شمیم احمد باذل، جاوید وارثی، محمد انور و چوہدری محمد اسلم کا ممنون ہوں کہ انہوں نے کتاب کی طباعت و اشاعت میں میری رہنمائی فرمائی۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے جید اہلِ قلم و سخنوران کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، پدما بھوشن گوپی ناتھ امن اعجاز وارثی سنبھلی، محمد احمد مختار، ڈاکٹر شاہ عبدالقیوم، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر انجمن آرا انجم، بیگم سلطان احمد کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس سلسلے میں میری رہنمائی فرمائی۔

محترم پروفیسر سحر انصاری صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف کراچی کا بیحد ممنون ہوں کہ انہوں نے شدید مصروفیت کے باوجود کتاب کا مسودہ ملاحظہ فرمایا۔ نیز کتاب کے مقدمہ کی صورت میں اپنے گرانقدر خیالات سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔

مذکورہ کرم فرماؤں کے علاوہ ان مخلص دوستوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جن کے تعاون کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ناممکن تھی، رہا تناہوں ان احباب کو میرے رسمی اظہارِ تشکر کی قطعی خواہش نہیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ وہ اس کو ناپسند فرمائیں گے۔ لہٰذا ان احباب کے اسمائے گرامی ظاہر کیے بغیر ان کا بقلب صمیم شکر گزار ہوں

سہ احوالِ دل بدوست چہ محتاجِ گفتن است
بر شمع سوزشِ پرِ پروانہ روشن است

شاہ عزیز الکلام

مقدمہ

شاہ عزیز الکلام ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے خاصے معروف و متعارف ہیں۔ ان کا تعلق دلی کے ایک علمی گھرانے سے ہے وہ اپنا ایک جداگانہ مزاج رکھتے ہیں۔ حالات سازگار ہوں یا ناسازگار شاہ عزیز الکلام کو اپنی مرضی کا کام کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ قلندری اور درویشی، اقدارِ حیات کی پاسداری میں عمر کا بیشتر حصہ گزار دیا۔ تحریر اور مطالعے کی یکجائی کا یہاں بھی وہی اثر ہوا جو عموماً ہوا کرتا ہے یعنی چراغ سے چراغ جلانا۔ بہت مدت پہلے ان کی نظر سے ایک مضمون گزرا تھا: "اردو کے ان پڑھ شاعر" ادھر نامعلوم کس طرح یہ مضمون ان کے ذہن میں تازہ ہوا اور انہوں نے "ان پڑھ" یا "امی" شعراء کا کلام اور ان کے کوائف جمع کرنے پر توجہ مرکوز کر دی۔ چند سال کی کاوش کے بعد اچھا خاصا مواد اکٹھا ہو گیا جو اب "اردو کے امی شعراء" کی صورت میں جلوہ گر ہوا چاہتا ہے۔

شاہ عزیز الکلام کی کتاب "اردو کے امی شعراء" کو ایک نوع کا تذکرہ ہی کہنا چاہیئے۔ تذکرہ نگاری کی روایت خاصی قدیم ہے۔ عربی اور فارسی کے قدیم مسکنوں سے گزرتے ہوئے جب ہم برصغیر پاک و ہند میں داخل ہوتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شعراءِ اردو کے ابتدائی تذکرے بھی فارسی زبان میں لکھے گئے۔ اس ضمن میں میر تقی میر کے "نکات الشعراء" اور حمید اورنگ آبادی کے "گلشنِ گفتار" کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اردو شعراء کے اولین تذکرے جو اردو میں لکھے گئے ان میں گلشنِ ہند کو کئی اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔

اردو میں تذکروں پر خاصے وقیع کام بھی ہوئے ہیں کہ ڈاکٹر فرمان فتح

پوری، مشفق خواجہ اور ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس ضمن میں بطور خاص قابل ذکر دیے متعدد اہم تذکرے شائع ہو چکے ہیں لیکن اب بھی کچھ مخطوطات منتظر تدوین و اشاعت ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" سے تذکرہ نگاری کا ایک دور مکمل ہوا اور اسی کتاب سے تنقید اور ادبی تاریخ کا آغاز ہوا۔ گویا آبِ حیات عام تذکروں کے برعکس تذکرہ، تاریخ اور تنقید کا سنگم ہے۔

آبِ حیات کے بعد بھی گذشتہ ایک صدی کے دوران متعدد تذکرے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کی بیشتر افادیت یہ ہے کہ اس طرح شعراء کے کوائف، نمونۂ کلام اور کہیں کہیں مؤلف کی اپنی تاثراتی یا تنقیدی آرا تک عام پڑھنے والوں کی رسائی ہو جاتی ہے۔

شاہ عزیز الکلام کے تذکرے میں انفرادیت کے کئی رُخ ہیں لیکن ان پر گفتگو سے قبل میں لفظ "اُمّی" کی وضاحت اور اس کے معنی کے مختلف پہلوؤں کا سرسری جائزہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔

مستند لغات میں "اُمّی" کے معنی یہ درج ہیں جو نہ لکھ سکے نہ پڑھ سکے۔ ان پڑھ ناخواندہ، بے پڑھا لکھا۔ نفیس اللغات (ترجمہ غیاث اللغات) صفحہ ۴۸ پر لکھا ہے۔

حقیقت میں منسوب اُم سے یعنی ماں۔ یعنی وہ شخص کہ جس کا باپ اس کے لڑکپن میں مر جائے اور وہ باپ کی تربیت سے محروم ہو کر اپنی ماں یا دایہ سے پرورش پائے اور اسی سبب سے لکھنا پڑھنا اس کو حاصل نہ ہو۔ مجازاً وہ شخص کہ اگرچہ باپ کے سامنے جوان ہوا ہو مگر لکھنا پڑھنا نہ جانے اور لفظ "اُمّی" لقب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی سبب سے ہے کہ آپ نے کسی سے تعلیم نہیں پائی تھی اور اس میں بھید یہ تھا کہ فضیلت استاد کی آپ پر ثابت نہ ہو۔

حافظ محمود شیرانی نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ "یعقوب عمر و صفار بن لیث اُمّی تھے۔

میرا خیال ہے کہ اُمّی کے معنی اور اس کے جواز کی خاص سے تصریح ہو گئی۔ چنانچہ شاہ عزیز الکلام کے اس تذکرے میں جب میں نے پہلی سرسری۔ احسان دانش، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، وگیر آبادی، میراجی وغیرہ کے نام دیکھے تو اندازہ ہوا کہ مؤلف نے انہیں ان پڑھ یا بے پڑھے لکھے کے معنوں میں اُمّی نہیں کہا ہے بلکہ ایک مفہوم یہ سامنے رکھا ہے کہ جن کی باقاعدہ تعلیم نہ ہو سکی یا جو کسی وجہ سے تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ لیکن انہوں نے اپنی ذاتی کاوش اور استعداد سے وہ مقام حاصل کیا کہ اب ان میں سے بیشتر پر پی ایچ۔ ڈی کا کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔

شاہ عزیز الکلام نے اگرچہ ایسے شعراء کا کلام اور ترجمہ بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے جن کا تخلص ہی اُمّی یا ان پڑھ تھا جیسے اُمّی دہلوی اور ان پڑھ امروہوی۔ تاہم خود مؤلف کا کہنا ہے کہ کتاب کی اشاعت سے میری مراد ان اُمّی شعراء کی تحقیر و تضحیک مقصود نہیں۔" دراصل وہ بین السطور اس حقیقت پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی تک کا عام معاشرہ علم و فضل سے کس قدر قریب تھا شعر و ادب کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ شاعری کو ایک مقدس فن سمجھا جاتا تھا اور علم مجلسی و آداب محفل کو برتنے ہی شعر سخن سے قدم قدم پر مدد لی جاتی تھی۔ ان پڑھ یا کم سواد کو حقارت سے نہیں بلکہ اللہ کی ذاتی صلاحیتوں اور خداداد خلاقی کی بنا پر تحسین و آفریں کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا بلکہ بقول مؤلف۔

> "حقیقت یہی ہے کہ اردو کے یہ نابغۂ روزگار شعراء کسی درس گاہ سے فارغ التحصیل نہیں تھے۔ یہ محض اپنی ذہانت، موزونئ طبع اور ماحول کی وجہ سے فکر سخن کرتے تھے اور جن زمینوں میں قدم رکھتے تھے ان کو بزور طبع خداداد سرانجام دیتے تھے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ شاہ عزیز الکلام کا جذبہ بہت نیک ہے۔ تحفظ اقدار، ادب دوستی اور انسان شناسی کے جو عناصر شاہ صاحب کی شخصیت میں ہیں ان کا تقاضا تھا کہ اس نوع کا کوئی تحقیقی کام کر کے وہ ان شعراء کے کلام اور نام کو یکجا کر دیتے جنہیں وہ توقیر و تکریم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس تذکرے کو پڑھ کر مولوی عبدالحق کے "چند ہم عصر" اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے "گنج ہائے گراں مایہ" کی یاد تازہ ہو گئی کیونکہ ان میں با ترتیب نام دیو مالی اور نور خان نیز کندن جیسی گمنام اور "نا" شخصیتوں پر اعلیٰ دیبے

کے خاکے لکھے گئے ہیں جو نامور اور اعلیٰ شخصیتوں سے زیادہ بھرپور اور قابلِ قدر ہیں اور جس طرح ان خاکوں میں مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کی شخصیت کی زیرکی، ہمہ جہتیت اور انسان دوستی بین السطور ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اسی طرح اُمّی شعراء کے اس تذکرے کی تمام تر کاوش میں شاہ عزیز الکلام کا جذبۂ احترامِ آدمیت و تقدیسِ فن ابھرتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایوانِ سخن کے ان ارکین کو سلیقے کے ساتھ منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں جنہیں خود ساختہ یا (SELF MADE) کہا جا سکتا ہے۔

خود غرضی، مسابقت اور آپا دھاپی کے ادوار میں جہاں ہر ہر قدم پہ غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ان شعراء نے گرم و سردِ زمانہ اور ناساعد حالات سے گزر کر یہ ثابت کیا کہ طبقاتی، معاشی اور سماجی ناہمواری کے ہنگموں سے بچنے بچانے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے بالآخر یہ قطرۂ نیساں گہر بن کر رہے۔

شاہ عزیز الکلام کے اس تذکرے کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے اسے کسی خاص دبستان یا لسانی حوالے تک محدود نہیں رکھا۔ اس میں شاعرِ ہفت زبان حضرت سچل سرمست بھی ہیں اور رحمت سرحدی، اللہ ساجد سرحدی بھی، ضیاء تھتھوی بھی ہیں اور وحشت ملتانی بھی۔ علی سندھی بھی ہیں اور سرور صحرائی بھی۔ شاہ صاحب نے جو دنیائے سخن کے لعل و جواہر اکٹھے کئے ہیں۔ اس میں کسی ذاتی پسند، ناپسند یا جانبداری کو دخل نہیں ہے۔ خواتین میں سیدہ خیر النساء بہتر بریلوی کا تذکرہ اور کلام بطور خاص اہم ہیں۔ محترمہ بہتر بریلوی مولانا حکیم سید عبدالحیؒ مصنف گلِ رعنا و ناظم ندوۃ العلماء کی شریکِ حیات اور عالمِ اسلام کی جید شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کی والدہ ماجدہ تھیں۔

اُردو کے اُمّی شعراء ۱۷۸۲ء سے ۱۹۸۲ء تک کے ادوار کو محیط ہے گویا دو سو سال کی اُمّی لیکن نابغۂ روزگار شخصیتوں کا احوال، کلام اور دیگر تفصیلات اس میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام مسلسل محنت، شغف اور دیدہ ریزی سے

تعلق رکھتا ہے شاہ صاحب نے حتی المقدور اسے ایک جامع اور مستند تذکرہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کہیں کہیں تشنگی کے بعض ایسے نشانات ملتے ہیں جو شاید تذکرہ نگاری کا مقسوم ہی سمجھا جائے گا۔ اسی طرح کلام کی پیش کش اور بعض تواریخ کے استنباط میں عجلت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ لیکن ایسے کاموں میں اگر تکمیل PERFECTION یا مثالی تکمیل کا انتظار کیا جائے تو کیمیاگر کی محنت کی طرح شاید کبھی منصۂ شہود پر نہ آسکیں۔ "کار دنیا کسے تمام نکرد" کے مصداق آئندہ محققین اس میں اضافے کر سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر شاہ عزیز الکلام پوری اردو دنیا کی جانب سے تعریف و تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک اچھوتے موضوع پر توجہ دی اور دو سو سال کی ادبی تاریخ سے ایسے نام ڈھونڈ نکالے جو ان کے موضوع کا احاطہ کرتے رہے۔

کتاب میں شامل مواد کی فراہمی، نوعیت اور نقطہ نظر کے بارے میں شاہ صاحب نے اپنا موقف بیان کر دیا ہے اس سے کتاب کے مطالعے کا ایک رخ متعین ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ تذکرہ برصغیر کے بیشتر تہذیبی و لسانی مراکز کا احاطہ کرتا ہے اور دو سو سال کی مدت سے اس کا تعلق ہے اس لئے لسانیات خصوصی سماجی لسانیات (SOCIO - LINGUISTICS) کی نسبت سے اس میں بعض پہلو ایسے در آئے ہیں جن کا الگ سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

شاہ عزیز الکلام نے بلا شبہ ایک اہم کام سرانجام دیا ہے اور اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں "اردو کے آتش شعراء" ایک قابل قدر اضافہ ہے مجھے یقین ہے کہ اہل علم اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

پروفیسر سحر انصاری
صدر، شعبۂ اردو،
جامعہ کراچی، کراچی

اُمّی دہلوی

روشن بیگ نام، اُمّی تخلص تھا، اسم بامسمّیٰ تھے۔ تا اب دہلی سے غیر بودہ اور ۱۸۸۲ء کے آخر میں وہیں پیوندِ زمیں ہو گئے۔ اگرچہ علم سے بالکل کورے تھے مگر فطری ذہانت، موزونیت اور سخن سنجانِ دہلی کے فیضِ صحبت نے اُمّی کو بچپن ہی میں گلشنِ شعر و سخن میں محوِ خرام کر دیا تھا۔ اس زمانے میں دہلی میں ہر جگہ شاہ نصیر کا شہرہ تھا۔ موصوف سے شرفِ تلمذ حاصل کرنے والوں میں اُردو کے مایہ ناز شعراء ذوق، مومن اور تسکین شامل تھے۔ اُمّی بھی شاہ نصیر کی شہرت اور حسنِ اخلاق سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ یہی عقیدت انھیں شاہ نصیر کی خدمت میں لے گئی اور یہ شاہ نصیر کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

ذہانت، مشقِ سخن اور استاد کی توجہ سے بہت جلد ترقی کر گئے۔ بڑے بڑے مشاعروں میں اپنا کلام اس خوبی سے سناتے کہ کسی کو گمان بھی نہ ہوتا کہ اُمّی واقعی اسم بامسمّیٰ ہے۔

اُمّی کا کلام اُن کی ناخواندگی اور لاپرواہی کی وجہ سے تلف ہو گیا۔ تذکروں میں اُمّی کے یہ چار اشعار درج ہیں، وہی پیش کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان چار اشعار سے اُمّی کی فکر اور کلام کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا تاہم ان سے روزمرہ اور معاملہ بندی کا اظہار ضرور ہوتا ہے اور یہی ان کے کلام کی خوبی خیال کی جاتی ہے۔ بادشاہ دہلی ابو ظفر کے شعر پر کتنی عمدہ تضمین کی ہے۔

ظفر کا قول مجھ کو یاد ہے میں گرچہ ہوں اُمّی
جو دانا ہیں نہیں وہ سجۂ صد دانہ رکھتے ہیں

؎ جی دھڑکتا ہے کہ پہنچے میں نہ آجائے لچک
ہاتھ سے چھوڑ دیا میں نے ترا جان کے ہاتھ

؎ جہاں زنجیر ہم سنتے ہیں منگوا مول لیتے ہیں
تری زلفوں کے سودے میں یہ سودا مول لیتے ہیں

؎ گرمئ مے سے زباں پر آبلے پڑتے ہیں کیا
اے مغاں! اِس میں مغیلاں کی بھی پڑتی چھال ہے

---

maablib.org

اَن پڑھ امروہوی

حاجی مختار احمد صِدّیقی نام، اَن پڑھ تخلص تھا۔ یہ ۱۹۰۶ء میں امروہہ ضلع مُرادآباد محلہ شوال میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوگئے۔ نہایت دین دار، خوش اخلاق و خوش پوش شخص تھے۔ دہلی اور شملہ میں انگریز افسروں کے ہاں ملازمت کرتے تھے، اگرچہ قطعی حرف ناشناس تھے تاہم قدرت نے ذہانت، موزونیت اور حافظے سے پوری طرح نوازا تھا۔ سخن گوئی کا بچپن سے شوق تھا۔ فکر کی رسائی اور طبیعت کی صفائی سے شعر موزوں کرتے تھے۔ کسی سے باقاعدہ شرفِ تلمذ حاصل نہیں تھا۔ بس "خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ" کے مصداق تھے۔ البتہ امروہہ کے ممتاز عالمِ دین نسیم فریدی صاحب سے مشورۂ سخن کر لیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں امروہے کی سکونت ترک کرکے جب دہلی میں رہائش پذیر ہوگئے تو نواب سراج الدین احمد خان سائلؔ دہلوی کے چشمۂ فیض سے مستفید ہونے لگے۔ نہایت پُرگو اور زود گو شاعر تھے۔ انجمن نورِ ادب امروہہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے مشاعروں میں اکثر اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کرتے تھے۔ اس زمانے کے مشہور ادبی رسائل اور گلدستوں میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ اُن کا مجموعۂ کلام "کلامِ ان پڑھ" ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو ۱۹۵۵ء میں فریضۂ حج و زیارتِ حرمین شریفین سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔

ان پڑھ کو تمام بزرگانِ چشت خاص کر امروہہ کے مقتدر بزرگ شاہ ابنِ بدرِ چشت کرمانی سے گہری عقیدت تھی۔ ۱۹۶۴ء میں اٹھاون سال کی عمر میں جب ان پڑھ کا شرار

وصال ہوگیا تو ان کی خواہش کے مطابق درگاہِ بدرِ چشت کے احاطے میں انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا ؎

بوقتِ صبح چو مردم بہ کار و بار روند
بلا کشانِ محبت بہ کوئے یار روند

نمونۂ کلام حاضر ہے

حمد

شاہ و گدا کا وارث پروردگار تو ہے
ظاہر ہے کُل جہاں کا گو پردہ دار تو ہے

موجود ہے یہاں بھی، موجود ہے وہاں بھی
کوئے محمدیؐ میں پروردگار تو ہے

مفلس ہو یا تونگر تکتا ہے دَر کو تیرے
روزی رساں جہاں کا پروردگار تو ہے

حکمِ فنا بھی تیرا، حکمِ بقا بھی تیرا
دورِ خزاں بھی تو ہے، فصلِ بہار تو ہے

ہر صبح دم پرندے کرتے ہیں ذکر تیرا
کوئل پکارتی ہے پروردگار تو ہے

گنجِ لحد میں جا کر آنکھیں کھلی ہیں آن پڑھ
ساقی نہیں ہے کوئی پروردگار تو ہے

منقبت

شہِ ابرارؐ کے در پر ملے گا مدعا مجھ کو
اسی در پر تمازِ عشق کرتی ہے ادا مجھ کو

وصولِ پاک سے ہے فیض یابی بدرِ چشتی کو
ملے گا ان کے در سے فیضِ محبوبِ خدا مجھ کو

بگاڑے گا کوئی بن کر مخالف کیا بھلا میرا
ہے دامن میں چھپاتے بدرِ چشتی کی دعا مجھ کو

محبت ہی میں بدرِ چشتیؒ کی سرشار رہتا ہوں
ہے دامن میں چھپائے بدرِ چشتی کی دعا مجھ کو

مدینہ ہی کے جلوؤں کا یہاں پر عکس ہے ہمدم
شرابِ معرفت کا مل گیا ہے مے کدہ مجھ کو

مرے سر پہ ہے فیضِ چشتیاں سایہ کناں انیسؔ طرہ
ملا ہے سلسلہ بھی صابریہ چشتیہ مجھ کو

بھلا مجھ سا اَن پڑھ و بے نوا ہو کس طرح ثنائے مصطفیٰ
ہے کمندِ فکر تو نا رسا بہت اونچا ان کا مقام ہے

اپنے تخلص کے مناسبت سے کہتے ہیں:۔

الف کے نام ب آتا نہیں مردِ خدا تم کو
زباں کھولو گے کیا انیسؔ طرہ بھلا بزمِ سخنداں میں

دُور کیوں کر ہو مقدر کی خرابی انیسؔ طرہ
یوں تو ہم نام کے مختار ہیں مجبور نہیں

تمھیں جو علم ہے انیسؔ طرہ کتابوں سے نرالا ہے
مخاطب کون کر سکتا ہے تم کو لفظ جاہل سے

دوسری جنگِ عظیم کے دوران موری گیٹ دلّی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں ہندوستان کے چوٹی کے شعراء شریک تھے۔ ادیب شہیر خواجہ محمد شفیعؒ دہلوی اس بزمِ سخن کے مہتمم و منتظم اعلیٰ تھے۔ اس مشاعرے میں انیسؔ طرہ نے اپنی نظم "وطن کے سپاہی" ترنم سے بلند آواز میں پڑھی جو بہت پسند کی گئی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:۔

پھنس گئے آکے کشاکش میں جوانانِ وطن
پھٹ کے ہاتھوں میں نہ رہ جائے گریبانِ وطن
بجلیاں کوندتی ہیں آکے نشیمن کے قریب
گلشنِ ہند میں حیران ہیں جوانانِ وطن
تیری آزادی کا پرتو ہے حکومت تیری
تیری کوشش سے ہے سرسبز گلستانِ وطن
پھر تری تیغ میں کیوں زور نہیں آب نہیں
موجزن کیوں نہیں دل میں ترے ارمانِ وطن
غیر کے جذبۂ الفت پہ بھروسہ مت کر
مردِ میداں کی طرح خود ہو نگہبانِ وطن
آگیا غیر کے ہاتھوں میں تو پھر خیر نہیں
کھینچا تانی ہی میں پھٹ جائے گا دامانِ وطن
نوعِ انساں سے ہٹلر کو عداوت انیرؔ
اس کو خوں خوار سمجھتے ہیں محبانِ وطن

اکبر وارثی میرٹھی

صوفی خواجہ محمد اکبر خان وارثی نام اور اکبر تخلص تھا قصبہ بچرولی تحصیل باپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ نوشت وخواند کی استعداد معمولی سے زیادہ نہ تھی تاہم مبدء فیض نے بلا کا حافظہ اور موزونیت عطا کیے تھے۔ بچپن ہی میں لیلائے سخن پر جان نثار کر رہی تھی، یوں تو تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر موضوع خاص نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی رہا۔

اکبر وارثی کا تعلق میرٹھ کے متوسط، شریف و دین دار گھرانے سے تھا۔ انھیں بچپن ہی سے صوفیا، اور درویشوں سے گہری عقیدت تھی۔ ابتدائے شباب ہی میں عارف باللہ حاجی حافظ شاہ وارث علی سے بیعت ہو گئے تھے۔ کافی دنوں تک اپنے روحانی پیشوا کے فیوض و برکات سے مستفید ہوتے رہے۔ عبادت و ریاضت نے باطنی صفائی اور عشق رسول پیدا کر دیا تھا نعت خوانی اور میلاد خوانی کی محفلوں میں کثرت سے شرکت کرتے کرتے خود بھی شعر موزوں کرنے لگے۔ اس طرح نعتوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا۔ مجموعۂ کلام ۱۹۱۱ء میں "کلام اکبر" و "گلزار اکبر" کے نام سے کئی حصوں میں دتی پرنٹنگ ورکس دہلی سے شائع ہوا ہے۔ انھیں مدح گوئی میں استاد یگانہ، شاعر شیریں بیاں اور فرماں روائے ملک سخن کے خطابات سے نوازا گیا، عوام نے بھی انھیں شاعر نعت اقدس کے خطاب سے سرفراز کیا۔ کلام نہایت پاکیزہ، شستہ زبان، نیا رنگ، نیا خیال، عاشق رسول ﷺ جن کی نعت کا ہر مصرع لذت کیف وجدان ہے۔ نعت کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

بشر نور رب العلا بن کے آیا — نئے رنگ سے جا بجا بن کے آیا
کہیں لالہ و گل کہیں چاند سورج — تجلائے ارض و سما بن کے آیا
کیا بلبلوں کو اسیر محبت — چمن میں گل خوشنما بن کے آیا
بنے اولیا و انبیا سب براتی — جو دولھا حبیب خدا بن کے آیا

محبت کی میراث اکبر کو بخشی
جو تو وارثِ حق نما بن کے آیا

(۲)

زلفِ احمد پہ دل مبتلا ہوگیا
حق سے ملنے کا یہ سلسلہ ہوگیا
مصطفےٰ جب خدا پر فدا ہوگیا
خدا خود عاشقِ مصطفےٰ ہوگیا
ایسی صورت نہ پیدا ہوئی ہے نہ ہو
آپ پر حسن، خاتمہ ہوگیا
مٹ گیا اس کی نظروں سے نقشِ دوئی
جامِ توحید جس کو عطا ہوگیا
ربنا اغفرلنا ثبت اقدامنا
نام تیرا سمیع الدعا ہوگیا
لکھدیا لاکھ جرموں پہ لاتقنطو
ایک ہی لفظ میں فیصلہ ہوگیا

(۳)

اور تھوڑی سی ساقی پلادے مجھے
اب تو جو ہو سو ہو، جو ہوا ہوگیا
دین و دنیا میں پھر کیا کمی رہ گئی
جب کرم مرشدِ پاک کا ہوگیا
اور ہی رنگ اکبر کا ہے جب سے یہ
بندۂ وارث الاولیا ہوگیا

آنحضرتؐ کے لوری دینے کے واقعے کو کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ حلیمہ کہہ رہی تھی مرے گلعذار سوجا
ترے جاگنے کے صدقے مری جانِ زار سوجا
تجھے دے رہی ہوں لوری کرتی ہوں پیار سوجا
راتوں کو جاگتا ہے مرے ہوشیار سوجا
بنی سعد کا قبیلہ ہوا باغ باغ تجھ سے
مرا دودھ پینے والے گلِ نوبہار سوجا
کیا جانے کیا کریں گی تری شرمگیں نگاہیں
ہیں ــ غافلوں کے حق میں تری ہوشیار سوجا

مرا دل ہو تجھ پہ واری، مری جاں ہو تجھ پہ تصدق
مرے نورِ عین سو جا، مرے شیر خوار سو جا

ہے یہ وعدہ اس کا سچا، اللہ بخش دے گا
اُمّت کے مارے اتنا نہ ہو بے قرار سو جا

ہے یہ عین وقتِ راحت مرے سینے سے لپٹ جا
آنکھوں میں نیند کا ہے تیری خمار سو جا

تری چاند سی جبیں پہ مری روح ہو تصدق
تیری مست انکھڑیوں پہ مری جاں نثار سو جا

ہوا دمِ پائے شہ پر تو کہا خدا نے اکبر
ترا اتنا جاگنا ہے مجھے ناگوار سو جا

(۴)

ہوا یہ عشقِ یادِ مصطفےٰ میں
کہ اُڑ جاؤں مدینے کو ہوا میں

الٰہی تو ہے اور محبوب تیرا
ہمارا کون ہے روزِ جزا میں

دِکھا دے ایسا دن بھی یا الٰہی
کہ دوڑوں کوہِ مروا اور صفا میں

ہُوا ظاہر جو یثرب کو چلی روح
اُڑا تختِ سلیمانی ہَوا میں

بنے گی شکلِ بوئے گل مری روح
چمن زارِ مدینہ کی فضا میں

دمِ پرسش میں کہہ کر شافعِ حشر
پکاروں گا تمہیں روزِ جزا میں

وہیں موتی بنا اکبر وہ آنسو
جو نکلا یادِ محبوبِ خدا میں

maablib.org

اوگھٹ بچھرایونی

شاہ بدرالدین نام اور اوگھٹ تخلص تھا۔ بچھرایوں ضلع مرادآباد کے صابری چشتی و قادری خاندان کے چودھری شمس الدین کے گھر [illegible]ء میں پیدا ہوئے۔ موصوف نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ والد کے سایۂ عاطفت سے جلد محروم ہو جانے کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ انھیں والد کی وصیت کے مطابق مرادآباد کے ممتاز بزرگ حاجی وارث علی شاہ کی خدمت میں دے دیا گیا۔ حاجی صاحب نے انھیں کچھ دن اپنے پاس رکھ کر انکی تربیت کی۔ بعدازاں اپنے والد کے مزار پر رہنے کا حکم دے کر واپس بچھرایوں بھیج دیا۔

اوگھٹ اپنی ابتدائی زندگی میں اپنے پیر و مرشد کو مشائخین کا کلام ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی طبیعت خود شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئی۔ اور یہ جذب و اثر میں ڈوبے ہوئے اشعار خود کہنے لگے۔ اوگھٹ نے نظم، غزل، اور حمد و نعت کی صورت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، پاکیزگی اور جذب و اثر نمایاں طور پر موجود ہے۔ مجموعۂ کلام "فیضانِ وارثی" کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۰۹ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۳۱ء میں زیورِ طباعت سے مزین ہوا ہے۔

اوگھٹ نہایت مشفق، وسیع الاخلاق، متوکل اور انسان دوست تھے۔ تمام عمر مجرد رہ کر اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں کو تمام انسانوں سے محبت کرنے کا درس دیتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں تقریباً ستر سال کی عمر میں پیٹنہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نمونۂ کلام حاضر ہے۔

حمد

خیال کر کے جو میں نے دیکھا اسی کی صورت چمک رہی ہے
اسی کا نقشہ ہے چار جانب، اسی کی رنگت دمک رہی ہے

نہ درد جائے گا چارہ سازو عبث تمہاری یہ فکر و کوشش
کسی حسیں کی یہ نوک مژگاں ہمارے دل میں کھٹک رہی ہے

بسی گلوں میں اسی کی بو ہے، پری وشوں میں اسی کی خو ہے
بتوں کے پردے میں دیکھ اوگھٹ اسی کی صورت جھلک رہی ہے

نعت

آباد جنوں میں کروں صحرائے مدینہ
ہو جائے اگر الفت لیلائے مدینہ

یارب نہ لگے روضۂ رضواں میں مرا دل
گھبرا کے شب و روز کہوں ہائے مدینہ

پوچھیں گے نکیرین تو کہہ دوں گا یہ زاہد
ہے مالک و مولا مرا آقائے مدینہ

زاہد مجھے تا حشر خمار اس کا رہے گا
پی آیا ہوں میں ساغر صہبائے مدینہ

اوگھٹ نہ رہے پھر مجھے کونین کی خواہش
قسمت سے جو مسکن مرا ہو جائے مدینہ

غزل

شرم کیسی فقط بہانہ تھا　　دیکھ کر مجھ کو منہ چھپانا تھا

شیخ فردوس جس کو کہتا ہے　　　وہی اپنا غریب خانہ تھا
گھر میں اللہ کے یہ رہتے تھے　　　ان بتوں کا بھی اک زمانہ تھا
دی جگہ در پہ شاہ وارث نے　　　ورنہ اوگھٹ کہاں ٹھکانہ تھا

چند اشعار:۔

سہ　زیان ہوش کیا عشق میں یہ کیا ہم نے
بتوں کو سجدہ کیا جان کر خدا ہم نے

سہ　شیخ نے کی رہن مے دستار آج
مل گیا رندوں میں یہ ابرار آج

سہ　عشق رہبر ہے پیشوا ہے عشق
اپنی کشتی کا ناخدا ہے عشق

اخگر مرادآبادی

منشی امداد حسین نام اور اخگر تخلص تھا۔ ان کے والد امیر اللہ نے مراد آباد کی سکونت ترک کر کے جب کانپور میں رہائش اختیار کر لی تو اخگر کو تعلیم کے لیے مشن اسکول میں داخل کر دیا گیا مگر حالات کی نامساعدت کی بنا پر ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ملازمت کی غرض سے ۱۸۹۱ء میں شملہ پہنچے اور گورنمنٹ پریس شملہ میں کمپوزیٹر اور کاپی ہولڈر کی حیثیت سے تقریباً بیس سال مذکورہ پریس میں خدمت انجام دی۔ شعر گوئی کا بچپن سے بے حد شوق تھا۔ شبیر علی خاں تنہا سے تلمذ حاصل تھا۔ جو کچھ موزوں کرتے اسے استاد کی اصلاح سے مزین کر لیتے تھے۔ کلام سادہ اور لطیف جذبات سے آراستہ ہے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مجموعۂ کلام "رباعیاتِ اخگر" کے نام سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی اخگر کے کلام کی تعریف کی ہے۔ اخگر نے تقریباً پچاس سال اردو شاعری کی خدمت کی بالآخر زندگی کی ستر بہاریں دیکھ کر ۱۹۴۲ء میں وفات پا گئے۔ نمونۂ کلام حاضر ہے ؎

غزل

تمہاری تیغ کا میں نے تڑپ کر لے لیا بوسہ
تمہیں بھی چاہیئے منہ چوم لو بسمل کی ہمت کا

مری جاں زلف کو عارض پہ لٹکانے سے کیا مطلب
کتاب اللہ کو کافر سے پڑھوانے سے کیا مطلب

عطا ہوتے رہیں خلعت عشق کی درگاہ سے ان کو
جو ان کے چاہنے والے ہیں وہ کفنائے جاتے ہیں

تصدق ہوتی ہے خود زندگی ان خوش نصیبوں پہ
بسِ مردن ترے کوچے میں جو دفنائے جاتے ہیں

رباعیاں

بے کشمکشِ زیست نہ جینا اچھا
گر تلخ ہو مَے ، نہ پینا اچھا
اس عطر سے جو مفت میں مل جائے کہیں
محنت سے جو بہتا ہے پسینہ اچھا

دکھ درد میں اوروں کا جو غم خوار نہ ہو
بے یار و مددگار کا جو یار نہ ہو
جنّت تو ملے اس کو مگر اے اخگرؔ
جنت میں خدا کا اسے دیدار نہ ہو

سورج کی شعاعوں کو بھی چوسا تم نے
موجوں کی ہواؤں کو بھی چوما تم نے
غنچو! تمہیں شبنم کی قسم ، سچ کہنا
مالی کی حقیقت کو بھی سمجھا تم نے

اسیر دہلوی

ان کا نام بیلتھیز (Belthezea) اور اسیر تخلص تھا۔ یہ فرانسیسی نصرانی تھے۔ ان کے باپ شمرو یا سومرو دہلی میں رہتے تھے، دہلی میں طویل عرصہ رہنے کی وجہ سے دہلوی کہلانے لگے۔ ظفریاب خان رین ہر تھ خاندان سے تعلق تھا جن کا دربار مرجع شعرا تھا۔ اسیر ان محفلوں میں اکثر شریک ہوتے تھے، انہیں اردو شاعری سے روشناس ہوئے۔ استادِ وقت شاہ نصیر سے تلمذ حاصل کیا اور سخت محنت سے فنِ سخنوری میں وہ کمال بہم پہنچایا کہ اہلِ زبان بھی داد دینے پر مجبور تھے۔

لمبے تڑنگے تنومند اور زور آور شخص تھے۔ ساتھ ہی بڑے زود فہم اور پرگو شاعر واقع ہوئے تھے۔

نمونۂ کلام حاضر ہے ؎

اسیر اس بحرِ الفت میں نہیں گر آشنا کوئی
تو کیوں موجِ رواں ہے صورتِ زنجیر کیا باعث

ہم اس آئینہ رو کے ہجر میں یوں زیست کرتے ہیں
کہ سکتے کی سی حالت ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

جا نہ تو دامن کش سوئے گلستانِ گل
ورنہ کرے گا وہ وہیں چاک گریبانِ گل

چاہیئے تعمیر کیا مرقدِ عشاق پر
بس ہے یہ خیمہ سیاہ دودِ چراغانِ گل

بزم میں رندوں کی رات یونہی گئے شیخ جی
جام تھا، مینا تھا اور رشکِ گلستانِ گل

اُس گلِ خوبی بغیر آنکھوں میں میرے اسیر
باغ ہے زنداں نما، زخم نمایانِ گل

ایک دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

نذر دل کرتے ہیں اس محبت کو وے کیا کیجئے
پھر نہ آیا کبھی ہم کو وہ دل آزار نظر

دل رہِ عشق میں جاتا نہ سر شام کہیں
مار ڈالیگی نہ تجھے زلفِ سیاہ فام کہیں

روز و شب اپنی یہ اوقات بسر کرتا ہے
زلف و عارض ہی میں دل صبح کہیں شام کہیں

دل بجا رات جنوں سے تجھے مدیاں تو ہوا
پرتپ عشق میں ہو جاتے نہ سرسام کہیں

مردماں چشم نمائی نہیں کرتا ہے ضرور
طفلِ اشک ہو دیں مرے تاکہ نہ بدنام کہیں

ایسی نزدیک ہے عارض سے وہ کاکل اسکی
کیا نہیں تم نے سنا روم کہیں شام کہیں

شمع فانوس میں در پردہ جلی ہے دیکھو
شعلہ آہ نکالے ہے جگر سے باہر

امیرؔ دہلوی

میر امیر علی نام، امیرؔ تخلص تھا۔ دلّی میں شاہی زمانہ کے شرفاء کی نشانی تھے۔ والد میر مومن علی متوسط الحال تھے شومیٔ قسمت در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پر مجبور ہوئے۔ زندگی افلاس و تنگدستی میں بسر کر دی لیکن حمیت ذاتی نے دامن خودداری پر کوئی بدنما داغ نہیں آنے دیا۔ یہی سبب تھا کہ اپنے فرزند امیرؔ کو تعلیم نہ دلا سکے۔ رسم مروجہ کے مطابق مسجد میں پڑھنے بٹھائے گئے مگر جب مسجد مدرسہ سے نکلے تو بالکل کورے کے کورے تھے حتیٰ کہ نام تک نہیں لکھ سکتے تھے۔ ہر چند حروف ناآشنا تھے تاہم علماء و صلحاء کی صحبتوں میں رہ کر اچھی خاصی معلومات بہم پہنچالی تھی۔ خزانۂ قدرت سے طبع موزوں اور ذہن رسا لائے تھے۔ شعر گوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ شوق، محنت اور حکیم عزت اللہ عشقؔ کی اصلاح سے بہت جلد اچھے شاعر بن گئے۔ مشاعروں میں حافظے کی مدد سے کلام سنا کر شرکائے بزم کو لطف اندوز کرتے اور خوب دادِ تحسین حاصل کرتے، دہلی ہی میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

خوب دیکھا ہے ہمنے خوباں کو — پھول خوش رنگ ہیں پہ باس نہیں
بولا وہ دیکھ کر امیرؔ کا حال — اس کے جینے کی اب تو آس نہیں

؎
ہم کو حاصل کیوں کہ ہو تیرے قدِ زیبا کا سیر
کب میسر ہو سکے ہے عالمِ بالا کی سیر

؎
وفا پیشہ ہوں شکووں سے مجھے کیا کام ہے ساقی
مری تشنہ لبی بھی تیرا اک انعام ہے ساقی
مجھے محروم رکھنے میں بھی کوئی مصلحت ہوگی
ترا فیضِ نظر تو سب کی خاطر عام ہے ساقی

احسان دانش

احسان الحق نام اور احسان تخلص تھا۔ عام طور پر احسان دانش کے نام سے معروف تھے۔ احسان کے والد قاضی دانش علی دین دار و درویش صفت شخص تھے۔ انھیں برصغیر کے ممتاز عالم دین حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے شرف بیعت بھی حاصل تھا۔ قاضی صاحب کو سخن گوئی کا شغف تھا اور اس فن میں قاضی محمد ذکی کاندھلوی سے جو خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے ارشد تلامذہ میں تھے، تلمذ تھا۔ اپنے پیرو مرشد سے زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کرنے کے لیے احسان کے والد نے مظفر نگر چھوڑ کر کاندھلہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ احسان دانش کاندھلہ میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ ہوشیار ہوئے تو کاندھلہ ہی کے ایک مدرسے میں پڑھنے بٹھا دیے گئے۔ مگر یہ چوتھی جماعت سے آگے پڑھ نہیں دیے۔ احسان کا میلان طبع بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف تھا۔ باوجود علمی کم مائیگی کے انھوں نے ذاتی شوق اور سخت محنت سے اپنے کلام کو تقویت دی یہاں تک کہ اپنے زمانے کے بلند پایہ شاعر تسلیم کیے گئے۔ فن شعر و سخن میں بھی کسی سے تلمذ حاصل نہیں تھا۔ بس "خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کے مصداق تھے۔ موصوف نے نظم، غزل، رباعی، مسدس، گیت، دوہا اور مرثیہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ سلاست زبان کے ساتھ انداز بیان بھی دل کش اور موثر تھا۔

احسان دانش نے زندگی کے تلخ تجربات کی روشنی میں اپنے کلام کو جلا بخشی ہے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کے کلام نے قبول عام کی سند حاصل کر لی تھی۔ حکومت پاکستان نے بھی ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں "ستارۂ امتیاز" کے خطاب سے نوازا ہے۔ علاوہ ازیں موصوف رائٹرز گلڈ، اکیڈمی آف لیٹرز، مرکزی اردو بورڈ، فلم سنسر بورڈ کے رکن رکین تھے۔

احسان دانش کی زندگی جہد مسلسل کی کہانی ہے۔ وہ ایک درویش صفت اور فقیر منش متوکل شاعر تھے انھوں نے زندگی کی جہد مسلسل اور شاعری کی ریاضت کو اپنے لئے

حرزِ جاں بنایا ہوا تھا۔ اگرچہ شاعری ان کو ورثے میں ملی تھی، مگر وہ اس پہ قانع نہیں ہوئے۔ صحیح معنوں میں وہ ایک شاعرِ مزدور تھے۔ ان کا دل ہمیشہ مزدوروں، بیواؤں اور یتیموں کے لیے دھڑکتا تھا۔ موصوف نے اپنی شاعری کو مظلوم طبقوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اپنے لیے انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ معاشی تنگی کے باوجود خودداری و انا کو برقرار رکھا۔ عمر بھر کسی سے صلہ یا انعام کے آرزومند نہیں رہے ؎

احسان کو نزدیک سے دیکھو تو یقیں ہو
نادار تو ہے بندہ حاجات نہیں ہے

جور و جفا، غربت و افلاس کے شکنجوں میں جکڑا ہونے کے باوجود انھوں نے بڑے بڑے سرمایہ داروں، جاگیرداروں، زمین داروں، استمگروں اور کج کلاہوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حقیقت میں وہ ایک مردِ خود آگاہ اور شاعرِ قلندر تھے۔ انھیں اپنے اللہ پر کامل بھروسہ تھا۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

کسی جگہ مرے کیوں ہاتھ پھیلتے دانشؔ
بہت قریب رہا ہے مرا خدا مجھ سے

احسانؔ دانش کو مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ انھیں حج بیت اللہ اور روضۂ اقدس پر حاضری کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ عشقِ حبیبؐ ان کے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ علامہ اقبالؒ کی طرح جب آپ کے سامنے آنحضرتؐ کا ذکر کیا جاتا تو آنکھیں فرطِ محبت سے اشک بار ہو جاتی تھیں۔ فخرِ موجودات، تاجدارِ دوعالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ادب و احترام کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کا تذکرہ بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے ؎

رخِ خیر البشرؐ تو بس رخِ خیر البشرؐ ٹھہرا
ان آنکھوں سے درِ خیر البشرؐ دیکھا نہیں جاتا

کھڑا ہوں کب سے محرابِ حرم کے سامنے دانشؔ
نظر رہ رہ کے اٹھتی ہے مگر دیکھا نہیں جاتا

مسلسل ہو رہی ہے جانے کیوں امت کی رسوائی
دعاؤں میں یہ افلاس اثر دیکھا نہیں جاتا

احسان دانش کو مزدوروں اور دیگر مظلوم طبقوں کی ترجمانی کرنے کی وجہ سے انھیں ترقی پسند تحریک سے وابستہ کر دیا گیا ہے جو حقیقت کے خلاف ہے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء کے دور کے لکھنے والے سب کے سب ترقی پسند نہیں تھے۔ بعض محض جدید رنگ کے علمبردار تھے۔ احسان دانش کی درج ذیل نظم "بھیک" اس رنگ کی آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

بھیک

صبح کا آغاز آتے ہی کو تھا انجام پر
سُرخ چھاپوں کی سیہ چنری تھی دوشِ شام پر
ہو چلے تھے شہر کے پیچوں کے سائے تیرہ فام
میّتِ خورشید کی تکفین کا تھا اہتمام

(۲)

چوک کے کونے پہ لیڈر بکس سے بالکل قریب
جمع رہتے ہیں جہاں مزدوری کرنے کو غریب
بند دکاں کے تھڑے پر اک گداۓ بے دماغ
زہد کے سینے کا پھوڑا، فقر کے ماتھے کا داغ
تنگ پیشانی، دھنسی آنکھیں ذرا ابھرے سے گال
رنگ میلا، گول ٹھوڑی کے تلے ڈھیلی سی کھال
نشہ سے آنکھوں کی سرخی، سرخ تر ہوتی ہوئی
شام سے قصدِ جرائم میں سحر ہوتی ہوئی
جھرّیوں سے کھردرا پن چہرۂ بے آب میں
جیسے کھل جاتی ہیں درزیں سوکھ کر تالاب میں

بے کسوں کا رُوپ دھارے، بال بکھرائے ہوئے
داؤں میں اپنے کھڑا تھا ہاتھ پھیلائے ہوئے
دے رہا تھا یہ صدا رفتار گاہِ عام پر
جانے والے کچھ تو دیتا جا خدا کے نام پر

(۳)

ایک منعم چند معمولی سے انسانوں کے ساتھ
جا رہا تھا ناز سے ڈالے ہوئے جیبوں میں ہاتھ
صاف چہرے سے نمایاں جزرسی حجام کی
کفر کا لیبل نہ پیشانی پہ چِٹ اسلام کی
خال و خد سے بیوفائی کے قرینے آشکار
روغنی خوراک پر بوڑھی جوانی کا مدار
سُن کے اِس آواز کو اُس خود سر و خود کام نے
چار پیسے گِن کے یوں پھینکے گدا کے سامنے
سلطنت بخشی ہو جیسے شوم نے محتاج کو
تج دیا ہو جیسے اِک ادچھے نے تخت و تاج کو
جیسے اک رہزن امیرِ کارواں کے بھیس میں
جیسے ابلیسِ لعیں نوشیرواں کے بھیس میں
ہم سمجھتے ہیں مگر احسان ان اسرار کو
فطرتِ منعم کہاں دیتی ہے کچھ زردار کو
چلچلاتی دھوپ میں سائے کی شادابی کہاں
شعلۂ عصیاں میں شبنم کی سحر تابی کہاں
ظلمتِ تزویر میں رخشندگی ممکن نہیں
خوئے فرعونی میں ذوقِ بندگی ممکن نہیں

ہیں یہ سب اسباب و ساماں حفظِ دولت کے لیے
ڈر یہ ہے بھوکے نہ تل جائیں بغاوت کے لیے
مفلسی تنگ آ کے در آئے نہ صنعت گاہ میں
آ نہ جائیں فاقہ کش علم و عمل کی راہ میں
ان کا منشا ہے کہ اک ایسی جماعت بھی رہے
خود کو مجبور سمجھے ان کو ان داتا کہے!
خاک سے اٹھے نہ سوئے آسماں جس کی نگاہ
بے رحمی سے ہو چکا ہو جس کا ہر جوہر تباہ
مجر دلی ہو جس کی فطرت، بے حیائی جس کی خُو
جہل نے برفا دیا ہو جس کی غیرت کا لہو
کام دے جس کا تکلم بھیک کے دو بول تک
ظرف ہو محدود جس کا کاسہ و کشکول تک
بھیک کے ٹکڑوں پہ ہو جس کا مدارِ زندگی
منعموں کو جو کہے پروردگارِ زندگی
بے خبر اس راز سے شاید ہیں یہ عالی مقام
ایک مرکز پر نہیں رہتا زمانے کا نظام
پرچم آزادی کا آسانی سے جھک سکتا نہیں
روکنے سے خون کا سیلاب رک سکتا نہیں

غزل

وہ آ رہے ہیں بہار در پر لیے ہوئے حشر زندگی کا
ٹھہر ٹھہر گریۂ مسرت بھرم نہ کھل جائے عاشقی کا

نظر پہ جلوؤں کی حکمرانی دلوں پہ مایوسیوں کا پہرہ
اگر چھڑا لے امید دامن، کہاں ٹھکانہ ہے آدمی کا
نگاہِ ساقی کی مے فروشی خرد کو جھولا جھلا رہی ہے
برس رہے ہیں خودی کے نغمے یہ فیض ہے سازِ بیخودی کا
زمیں کے ذرّوں پہ خوف طاری فلک پہ تاروں کی بند آنکھیں
یہ زندگی کی سحر ہے کیسی، سماں ہے سب شامِ زندگی کا
ہے ختم اب جاں کنی کا منظر، نگاہ سجدے میں جھک گئی ہے
خدا خدا کر کے مدتوں میں خمار ٹوٹا ہے زندگی کا !
مُتانتوں کو کچل کے آنسو جو مژہ پہ کیوں تھرتھرا رہے ہیں
کہو تو احسان حال کیا ہے؟ مزاج کیسا ہے بیکسی کا

احسان دانش کی ۱۹۴۳ء کی منتخب نظموں سے ایک اور نظم ملاحظہ کیجیے ؎

ہر نفس بے سوز ہے، ہر آہ بے تاثیر ہے
کیا یہ محرومی خداوندا مری تقدیر ہے
زندگی اور موت دو عنوان بے شک ہیں، مگر
ایک ان میں خواب ہے، اک خواب کی تعبیر ہے
عمر کے بڑھتے تقاضوں پر نہ اندھیا دھند چل
بیٹھتی دیوار ہے، گرتی ہوئی تعمیر ہے
اک طرف خونِ غم الم، اک طرف کیفِ گناہ
یہ ترا منشا ہے، میں ہوں، یا مری تقدیر ہے
کاندھا کو چھوڑ کر احسان یہ ثابت ہوا
شہر ایمانوں کے گورستان کی تعمیر ہے

نثر کے میدان میں بھی احسان کا قلم ویسا ہی تیز گام تھا جیسا کہ نظم کے میدان میں۔ موصوف نے لاتعداد مضامین لکھنے کے علاوہ بہت سی کتابیں بھی تحریر کیں، جن میں سے چند یہ ہیں:۔

آتشِ خاموش، نوائے کارگر، گورستان، چراغاں، زخم و مرہم، دردِ زندگی، حدیثِ ادب، جادۂ نو، میراثِ مومن، نفیرِ فطرت، عکسِ آئینہ، غبارِ کارواں، زنجیرِ بہاراں، رموزِ غالب، مقاماتِ جہانِ دانش، نیرنگِ دانش، اردو مترادفات اور قاموسِ محاورات۔

آتش دہلوی

خواجہ حیدر علی خلف خواجہ علی بخش نام اور آتش تخلص تھا۔ آتش کے بزرگوں کا اصل وطن بغداد تھا۔ آباواجداد ترک وطن کرکے دہلی چلے آئے اور پرانا قلعہ میں سکونت پذیر ہوگئے۔ آتش ۱۱۶۹ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے ابھی چھوٹے ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اس لیے باقاعدہ حصول تعلیم کا موقع نہیں ملا۔ اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق علماء و امراء کی صحبتوں میں رہ کر بہت کچھ حاصل کرلیا۔ خداداد ذہانت، موزونیت اور مشق سخن سے اپنے کلام میں ایسی قوت پیدا کی کہ مسلّم الثبوت استاد تسلیم کیے گئے۔ اور سینکڑوں شاگرد ان کے دامن فیض سے تربیت پاکر استاد کہلائے۔ مصحفی جیسے یگانہ روزگار شاعر کو آتش کا استاد ہونے پر فخر ہے۔

آتش کشیدہ قامت، چھریرا بدن، ستواں ناک، سر پر بانکی ٹوپی حیدری چیٹا، نیام میں تلوار، سپاہیانہ وضع سے رہتے تھے۔ خواجہ زادوں کے خاندان سے تعلق کی بنا پر بچپن ہی سے مزاج میں فقیری کا رنگ غالب تھا۔ اسّی روپے ماہوار بادشاہ لکھنؤ کے یہاں سے ملتے تھے۔ یہ پندرہ روپے گھر میں خرچ کیلئے دیتے اور باقی رقم غرباء میں تقسیم کردیتے تھے۔ بس توکّل پر گزارہ تھا۔ نہایت خلیق اور ملنسار تھے۔

شیخ امام بخش ناسخ اور آتش کی نوک جھونک کس سے پوشیدہ ہے۔ دونوں اساتذہ کے سینکڑوں شاگرد مشاعروں میں دست و گریباں ہوتے تاہم یہ دونوں بزرگ سودا اور انشا کی طرح خود کبھی دست و گریباں نہیں ہوئے۔ ایک دوسرے کا پاس کرتے تھے۔ جب شیخ ناسخ کا انتقال ہوگیا تو خود آتش نے تاریخ وفات کہی اور اسی دن سے شعر کہنا بھی چھوڑ دیا کہ جس شخص کو سنانے کا لطف تھا جب

وہی نہیں رہا تو شعر کہنا فضول ہے۔

آتشؔ کے کلام میں صفائی اور روزمرہ محاوروں کا لطف ہے وہ سیدھی سادی بات کو استعاروں اور تشبیہوں سے مشکل نہیں بناتے بلکہ زبان اور محاوروں میں صاف صاف مطلب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اس سے اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل آتشؔ کی افتادِ طبع نے شاعری میں انہیں انفرادی حیثیت بخشی ہے۔ کلام میں سادگی کا اندازہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیے ہیں۔

آتشؔ کے شاگردوں میں رندؔ، صباؔ، خلیقؔ، نسیمؔ، نواب مرزا شوقؔ اور آغا حجو شرفؔ نمایاں ہیں۔ آتشؔ نہ صرف اپنے شاگردوں اور حلقۂ دوستاں میں مقبول ہوئے ہیں بلکہ منصف مزاج شعراء نے بھی ان کی بیحد تعریف و توصیف کی ہے۔

بالآخر ۱۸۴۶ء میں بعمر اڑسٹھ سال یہ عظیم المرتبت انسان اور خوش فکر شاعر تاریخ شعر و سخن میں کبھی نہ پُر ہونے والی خلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا اور اس طرح شعر و سخن کا یہ روشن باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

میر اوسط علی رشکؔ نے تاریخ وفات کہی ہے۔

ع۔ خواجہ حیدر علی اے وا مرد ۱۸۴۶ء / ۱۲۶۳ھ

نمونۂ کلام:۔

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

؎ اُس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر نبھے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

؎ پر کترتا ہے مرے صیاد تو کاٹ اس طرح
حسرتِ پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ

؎ لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

؎ کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود تک
میں بگولے کی طرح سے خاک اڑا کر رہ گیا

؎ راہ گزر میں دفن کرنا اے عزیزاں تم مجھے
شاید آجائے کسی کے میرا مدفن زیرِ پا

؎ مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ، بچاؤں کدھر کی چوٹ

؎ آپ کی نازک کمر پر بوجھ پڑتا ہے بہت
بڑھ چلے ہیں حد سے گیسو کچھ انہیں کم کیجیے

اصغر گونڈوی

اصغر حسین نام اور اصغر گونڈوی تخلص تھا۔ دراصل اصغر گونڈوی کے والد تفضل حسین گورکھپور کے رہنے والے تھے لیکن بحیثیت قانون گو گونڈہ میں ملازمت کرتے تھے۔ اصغر ۱۸۸۴ء میں گونڈہ میں تولد ہوئے۔ دینی تعلیم کے بعد باقاعدہ تعلیم کا آغاز گونڈہ ہی میں ہوا مگر نامساعد حالات کی وجہ سے وہ آٹھویں جماعت سے آگے نہ بڑھ سکے۔ البتہ خداداد ذہانت مطالعہ اور شوق کی بدولت عربی و فارسی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کی تھی شعر و سخن، علم و ادب اور مذہبی امور پر موثر گفتگو کرتے تھے۔ حصول معاش کے لیے کچھ عرصہ ادبی مرکز لاہور سے وابستہ رہے کچھ عرصہ انڈین پریس الہ آباد میں رسالہ "ہندوستانی" کے مدیر رہے، اور کچھ عرصہ محکمہ ریلوے میں ملازم رہے۔ آخر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چشموں کا کاروبار کرنے لگے تھے۔

اصغر گونڈوی کا میلان طبع بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف تھا۔ انھوں نے نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے دنیائے شعر و ادب میں قدم رکھا اور بہت جلد آسمان شاعری کے درخشندہ ستارہ بن کر چمکنے لگے۔ پہلے آپ وحید بلگرامی کے خوشہ چینوں میں داخل ہوئے۔ پھر تسلیم لکھنوی سے شعر و سخن میں استفادہ حاصل کیا دونوں استادوں کے فیض صحبت نے اصغر گونڈوی کے کلام میں پختگی اور انفرادیت پیدا کردی تھی۔ خداداد ذہانت، موزونیت، جدت خیال، تصوف کی آمیزش اور زبان و بیان کی خوبی کی وجہ سے ان کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اصغر گونڈوی نہایت نفاست پسند، خلیق، قانع اور وسیع المشرب شخص تھے۔ جگر مرادآبادی کی طرح انھیں بھی شاہ عبدالغنی منگلور شریف سے شرف بیعت حاصل تھا

اصغر گونڈوی کے کلام میں جو سوز و گداز پایا جاتا ہے وہ در اصل اسی وادیِ ایمن کی شرر باریاں ہیں۔

اصغر صاحب شعر بہت کم کہتے تھے۔ مگر جو کہتے تھے وہ منتخب ہوتے تھے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام اشعار ایک ہی رنگ اور ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ایسی یک رنگی اور ہمواری کی مثال دوسرے شعراء کے ہاں کم دیکھنے میں آتی ہے۔ انھوں نے قدرتِ بیان سے اپنی شاعری میں دلکشی پیدا کر کے اہلِ علم طبقے کو جلد اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ان کے کلام میں تشبیہات و استعارات کے علاوہ کیف و سرور اور سوز و گداز پایا جاتا ہے جو بہترین شاعری کی لازمی خصوصیت ہے۔

۱۹۳۶ء میں اصغر گونڈوی پر فالج کا حملہ ہوا اور ۲۶ نومبر کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انھیں الٰہ آباد میں حضرت شیخ محب اللہ کے مزار کے احاطے میں سپردِ خاک کر دیا گیا ؎

اصغر خاکسار وہ ذرۂ خود شناس ہے
حشر سا کر دیا بپا جس نے جہانِ راز میں

اصغر گونڈوی کا مجموعہ کلام "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" زیورِ طبع سے مزین ہو کر شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ نمونہ کلام پیشِ خدمت ہے۔

غزل

قفس کیا، حلقہ ہائے دام ہے کیا، رنجِ اسیری کیا
چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے

یہ نا آشنائے لذتِ پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

سمٹتے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

نعت

دل نثارِ مصطفیٰؐ جاں پائمالِ مصطفیٰؐ
یہ اویسِؓ مصطفیٰؐ ہے، وہ بلالِؓ مصطفیٰؐ

دونوں عالم تھے مرے حرفِ دعا میں غرق و محو
میں خدا سے کر رہا تھا جب سوالِ مصطفیٰؐ

سب سمجھتے ہیں اسے شمعِ شبستانِ حرا
نور ہے کونین کا لیکن جمالِ مصطفیٰؐ

عالمِ ناسوت میں اور عالمِ لاہوت میں
کوندتی ہے ہر طرف برقِ جمالِ مصطفیٰؐ

عظمتِ تنزیہہ دیکھی شوکتِ تشبیہہ بھی
ایک حالِ مصطفیٰؐ ہے ایک قالِ مصطفیٰؐ

دیکھیے کب حال کر ڈالے شبِ یلدائے غم
ہاں نظر آئے ذرا صبحِ جمالِ مصطفیٰؐ

ذرہ ذرہ عالمِ ہستی کا روشن ہو گیا
اللہ اللہ شوکت و شانِ جمالِ مصطفیٰؐ

نوحہ

آہ اصغرؔ آہ اے ملکِ سخن کے تاجدار
سو بہاریں تیرے اندازِ تکلم پر نثار
تیرے مرنے کا نہیں ہوتا ہے دل کو اعتبار
کیا یہ سچ ہے چل دیا تو دہر بے گانہ وار
کیا قیامت بن کے مرگِ ناگہاں آہی گئی
کیا دلوں پر نا امیدی کی گھٹا چھا ہی گئی

منتخب اشعار:-

؎ غزل میں درد رنگیں تو نے اصغرؔ بھر دیا ایسا
کہ اس میدان میں روتے رہیں گے نوحہ خواں برسوں

؎ جس پہ بت خانہ تصدق، جس پہ کعبہ بھی نثار
ایک صورت ایسی بھی سنتے ہیں بت خانے میں ہے

؎ یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

؎ چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

؎ نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ کچھ بقا معلوم
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم

بشیرؔ مرادآبادی

بشیر خاں دُرّانی نام اور بشیرؔ تخلص تھا۔ یہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ مورثِ اعلیٰ نور محمد خان دُرّانی نادر شاہ کی فوج کے سپہ سالار تھے۔ بشیرؔ کے والد فیاض دُرّانی جہانگیر آباد سے ترکِ سکونت کرکے اچھاری قصبہ حسن پور ضلع مرادآباد میں مقیم ہوگئے اور نوابین حسن پور کے ہاں تشخیص وصول کرنے کا کام کرتے تھے۔ میر پور خاص میں ۱۹۶۷ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔

بشیرؔ کی طبیعت بچپن ہی سے کھیل کود اور سیر و تفریح کی طرف مائل تھی۔ موسیقی سے بھی شغف تھا، خود بھی اچھا گاتے تھے۔ چالیس سال کی عمر تک کتے پالنا، گھوڑا سواری کرنا، شکار کھیلنا، پتا اور رنتوٹ بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ آخر میں سب شغلے ختم ہوگئے اور صرف شاعری باقی رہ گئی۔ باپ نے بہت چاہا کہ بشیرؔ پڑھ لکھ کر کسی قابل ہوجائے مگر انھوں نے پڑھ کر ہی نہیں دیا۔ نتیجتہً علم سے کورے رہ گئے۔ قدرت نے البتہ بشیرؔ کو غیر معمولی ذہانت، حافظہ اور موزونیت عطا کیے تھے۔ علمی استعداد نہ ہونے کے باوجود فطری موزونیت خضرِ راہ بنی اور بشیرؔ کے جذبات خود بخود شعر کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ جگرؔ مرادآبادی سے بچپن سے یارانہ تھا ان کی صحبت اور ہم نشینی سے تیغِ زباں کے جوہر کھلنے لگے۔ بالآخر بشیرؔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں جگرؔ صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد بشیرؔ ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان آگئے اور نواب شاہ کے قصبہ "ٹھٹا" میں سکونت پذیر ہوگئے۔ یہاں از سرِ نو زندگی کا آغاز کیا۔ موصوف کے کلام کے مجموعے (۱) جذب و گریز اور (۲) نادرات کے نام سے ۱۹۶۰ء میں کراچی سے شائع ہوئے تھے جنھیں علمی و ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔

بشیر کی شاعری کی بابت جگر مراد آبادی کے علاوہ ماہر القادری ڈاکٹر غلام مصطفیٰ شاہ، حامد حسین قادری اور رئیس امروہوی نے اپنی گراں قدر رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ بشیر کی غزل میں جہاں گل و بلبل کے تذکرے ہیں وہاں ہجر و وصال کے مرحلے اور مسلسل گریہ وزاری بھی ہے اور ساتھ ہی مسکراہٹیں بھی۔ رنج و غم کے خزانے بھی ہیں اور عیش و طرب کے دفینے بھی۔ خزائیں بھی اور بہاریں بھی۔ غرض یہ کہ غمِ جاناں ہی نہیں غمِ دوراں بھی ہے۔ لیکن بشیر کا کمال یہ ہے کہ ہر کیفیت میں ان کی انفرادیت موجود ہے۔ تقلید ان کا مزاج نہیں۔ نقالی ان کی فطرت ہی نہیں۔ ان کے ہاں زندگی پورے وقار کے ساتھ نمایاں ہے۔ دردِ مہجوری اور کربِ محرومی سے وہ لذت حاصل کرتے ہیں۔ اس سے گھبرا کر دل نہیں چھوڑتے۔ وہ منزل کے قریب پہنچ کر بیزار بھی ہونا جانتے ہیں اور ساحل کے قرب کا ساتھ دینا بھی جانتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:-

ے سفینہ جس قدر نزدیکِ ساحل ہوتا جاتا ہے
دلِ منزل طلب بیزارِ منزل ہوتا جاتا ہے

ے اب خدا جانے کہاں لے جائے منزل کا فریب
سیکڑوں ساحل نظر آتے ہیں ساحل کے قریب

بشیر کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ے سلسلہ ختم نہیں رنج و مصائب کا ہنوز
اب زیاں یہ ہے کہ احساسِ زیاں ہوتا ہے
کم رخی حسن کی بہتر نہ سمجھنے والے
اوجِ خورشید مسافر پہ گراں ہوتا ہے

دشمنِ دل ہی نہیں دشمنِ جاں ہوتا ہے   افسردہ احساس جو پیری میں جواں ہوتا ہے

بشیرؔ کی ایک اور غزل ملاحظہ کیجئے اور قادر الکلامی کی داد دیجئے۔

ے خوشی کو رنج سمجھا، رنج کو سمجھا خوشی میں نے
اشاروں پر ترے بدلا نظامِ زندگی میں نے

بہت دنیا کو میرے ہوش میں لانے کی کوشش ہے
اگر دنیا سے کہہ دی لذتِ دیوانگی میں نے

سمٹ آئے جہانِ حسن و الفت ایک مرکز پر
ذرا محسوس کر لی جب کبھی اپنی کمی میں نے

تری آواز نے برسوں مجھے مخمور رکھا ہے
کیا ہے مدتوں کانوں سے شغلِ میکشی میں نے

یہ سچ ہے آدمی خادم سے ہی مخدوم بنتا ہے
کہ دنیا پر خدائی کی بہ ذریعہ بندگی میں نے

بنا کر زینتِ دل لطفِ آغازِ محبت کو
اڑائی عمر بھر انجامِ الفت کی ہنسی میں نے

غرور و ناز سے بچنے کی تہمت کس طرح اٹھتی
بشیرؔ اچھی اٹھائی قیمتِ دیوانگی میں نے

بشیرؔ کے مختلف اشعار:۔

ے یاد کرنا اسے توہینِ محبت ہے بشیرؔ
کیا اسے یاد کریں گے جو فراموش نہیں

ے بدل دی فطرتِ سائل ترے در کی گدائی نے
طلب رکھتا ہوں لیکن ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا

ے چمن میں دیکھ رہی ہے مآلِ خندۂ گل — کلی کو پھر بھی جسارت ہے مسکرانے کی

بے تاب دہلوی

عبدالحمید نام بیتاب تخلص تھا۔ آپ ۵ر جنوری ۱۹۳۵ء کو مٹیا محل دتّی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں گوٹا زری کا کام کرتے تھے۔ بعد میں لال کنواں دہلی میں گیس کے ہنڈوں کی دکان کر لی تھی۔ محض حرف ناشناس تھے۔ شعرگوئی کا بے حد شوق تھا۔ قدرت نے موزونیت اور حافظہ سے نوازا تھا۔ ہر وقت نیفے میں کاغذ اور پنسل رکھتے تھے۔ جب کوئی شعر موزوں ہوتا۔ کسی لکھے پڑھے راہ گیر سے لکھوا لیا کرتے۔ مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہوئے اگر بھول جاتے تو برابر میں بیٹھے ہوئے شخص سے شعر کا پہلا لفظ پوچھ کر پوری غزل سنا دیا کرتے۔ شعر خداداد کہتے تھے۔ بیخود دہلوی سے شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ استاد کے ساتھ بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ تحسین وصول کرتے تھے۔ انھیں مصرعے پر مصرع لگانے میں کمال حاصل تھا۔ دہلی میں پہاڑی بوجھلہ میں ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ اس میں مقامی اور بیرون جات کے اکثر شعراء شریکِ محفل تھے۔ استاد بیخود نے بلند گرج دار آواز میں اپنی مشہور غزل "بے وفا کہنے سے کیا تو بے وفا ہو جائے گا" پڑھی بیتاب نے بھی اسی بحر میں اپنی پوری غزل پڑھی جس کا مطلع دتّی والے مدتوں گنگناتے رہے۔ مطلع یہ تھا ؎

مرنے والا جی اٹھا تو پھر فدا ہو جائے گا
آپ اِک ٹھوکر لگا دیں گے تو کیا ہو جائے گا

منتخب اشعار:

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوائی ہو ہوس
کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصر شیریں میں
جو میں ہوتا تو جائے تیشہ جو سے خوں رواں کرتا

تڑپ کر مر گئی بلبل قفس میں
پڑی تھی ہائے کس ظالم کے بس میں

اسے کہتے ہیں دنیا، شمر نے دنیا کے لالچ میں
امام دو جہاں کے حلق پر نوکِ سناں رکھ دی

کسی کی بے وفائی سے اگر ہم مر گئے تو کیا
چلو اچھا ہوا یوں بھی کسی کے کام تو آئے

ہمیں بیتاب کچھ شکوہ نہیں ان کی جفاؤں کا
ہمارے پاس وہ کل شب برائے نام تو آئے

maablib.org

بُوم میرٹھی

شیر محمد خاں نام اور بُوم تخلص تھا۔ یہ رنگین مزاج، بذلہ سنج خوش طبع ظریف تھے۔ ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ میرٹھ کے کسی دفتر میں چپراسی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ علمی استعداد بہت معمولی تھی، مگر قدرت نے بلا کی ذہانت اور موزونیت بخشی تھی۔ برصغیر کے مزاح گو شعرا میں اچھا خاصا نام پیدا کیا ہے۔ بُوم نے مزاح کے علاوہ سنجیدہ و متین کلام بھی کہا ہے۔ جس میں فوق تخلص کرتے تھے۔ نہایت زود گو اور پُر گو شاعر تھے۔

جس زمانے میں گاندھی جی انگریزی مال کا بائیکاٹ اور کھدر پہننے کا پروپیگنڈا کر رہے تھے اس وقت کھدر کی قیمت دوسرے بڑھیا کپڑوں سے بہت بڑھ گئی تھی۔ اس صورت حال سے متاثر ہو کر بُوم نے درج ذیل اشعار کہے جو بہت پسند کیے گئے۔

پہلے سے نہیں مفلس و محتاج جُلاہے
اب بھرنے لگے کوٹھیوں میں ناج جُلاہے
لیڈر تو گئے قید میں اک لاج کی خاطر
بیٹھے ہیں دبائے ہوئے سوراج جُلاہے

جب کہ دنیا میں خلافت کی دہائی ہو گئی
اچھی خاصی اِن جُلاہوں کی کمائی ہو گئی
ہو ترقی کس طرح ملبوس کھدر کی بھلا
چودہ آنے سیر گاڑھے کی کمائی ہو گئی

۱۹۲۳ء میں ہاپوڑ میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ بوم نے بھی اس میں اپنی مزاحیہ نظم پڑھی جس سے مشاعرہ زعفران زار ہوگیا۔ اس غزل کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

میں وہ شکّی ہوں بچوں پر بھی اپنے رشک کرتا ہوں
محبت میں لپٹ جاتے ہیں جب وہ اپنی اماں سے
مری باریک دھوتی دیکھ کر بیوی مری بولی
میاں ملبوس ہو کر بھی نظر آتے ہو عریاں سے

قیامِ پاکستان سے قبل کمبوہ دروازہ میرٹھ میں تمیزن نامی ایک مشہور طوائف کا قتل ہوگیا تھا جس کی اس زمانے میں بہت تشہیر ہوئی۔ بوم نے اس موقعے پر "قتلِ تمیزن" کے عنوان سے ایک نظم کہی تھی۔ اس نظم کا ایک شعر بہت مشہور ہوا۔ مدتوں لوگ اسے گنگناتے پھرتے تھے ؎

عدو تھانے میں بیٹھا آہ شفاخانے میں لیٹا ہے
پھنسایا ایک سسری کم سنی نے دو کو آفت میں

شہنشاہ اورنگ زیب کی بیٹی شہزادی زیب النساء مخفی کے مشہور شعر پر بوم نے تضمین کہی تھی جو بہت مشہور ہوئی ؎

مرقدِ دشمن کی جانب پھول وہ لے کر چلے
میری تربت سے جو گزرے دور سے مارے ڈھیلے
اس حرامی کی لحد پر رات بھر ہنڈا جلے
نے پرِ پروانہ سوزد، نے چراغ نے گلے

بوم کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے :-

انگریزی میں یہ جب فائق ہوتے
مغربی تہذیب کے شائق ہوتے
باپ کو کہنے کو لگے مائی ڈیئر
واہ کیا لائق یہ نالائق ہوتے

برشتہ لکھنوی

میر برشتہ نام اور برشتہ ہی تخلص تھا۔ لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔ پیر جلیلوں کے مزار کے احاطے میں مدفون ہیں۔

یہ الف کے نام ب نہیں جانتے تھے۔ مگر طبیعت کی صفائی اور فکر کی رسائی سے شعر موزوں کرتے تھے۔ نہایت پرگو اور زود گو تھے۔ استاذ الشعراء میر تقی میرؔ سے شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔ جو اب کہیں دستیاب نہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

ؔ ہنگامہ میری آہ سے کیا چرخ پر نہیں
وہ کون سی زمیں ہے جو اشکوں سے تر نہیں

ؔ دیکھا جو در بہ در اس نے برشتہ کو یہ کہا
کیا خانماں خراب کہیں تیرا گھر نہیں

ؔ جس قدر بدنام ہو عاشق وہ ہے نام آوری
پارسائے عشق وہ ہے جو کہیں رسوا ہوا

ؔ اتنا تو رحم کرنا مرے حالِ زار پر
آنا کبھی تو فاتحہ پڑھنا مزار پر

ؔ اب اتنا تو پاسِ محبت ادا کر
کبھی دور سے دیکھ جایا کیا کر

ماجرائے چشمِ تر ہرگز نہ کچھ افشا ہوا
اس قدر رویا قلم کاغذ کف دریا ہوا

شاہی لکھنؤ میں ایک بڑا طرحی مشاعرہ تھا جس میں مقامی اور بیرون جات کے نامور شعراء شریک تھے۔ مصحفی اور مخمور نے بھی اس بزم مشاعرہ کو زینت بخشی تھی۔

بزم سخن کی طرح تھی "لگائے بلبل" "آئے بلبل"
برشتہ کی غزل کا یہ شعر پسند کیا گیا اور بہت مشہور ہوا۔

گوشِ گل کے ترے نالوں نے ذرے سے کھولے
اب تو تالو سے زباں اپنی لگائے بلبل

برشتہ کی ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

کیا دہانِ تنگ سے کچھ غنچہ تنگ آتا رہا
برگِ گل تک اس لبِ نازک تپا تا رہا

مسکرا کر اس نے مارا ہاتھ پر میرے جو ہاتھ
کیوں نہ ہاتھ اپنے طوں دل ہاتھ سے جاتا رہا

رشتۂ تقدیر الجھا جاکے زلفِ یار سے
پیچ پڑتے ہی گئے جوں جوں میں سلجھاتا گیا

پھر نہ کوئی کارواں رفتہ سے یاں آیا پھر
ہر نفس مثلِ جرس میں گو کہ چلاتا رہا

اے برشتہ کس قدر تھا ترے دل کو اضطراب
جاں نکلی تن سے باہر تو بھی گھبراتا رہا

بنیاؔ بہاری

سید مظفر الدین احمد نام اور بنیاؔ تخلص تھا۔ یہ ۱۸۹۸ء میں محلہ میرداد قصبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ حافظ عبدالغفور آنزیری مجسٹریٹ پٹنہ کے صاحبزادے اور نواب نصیر کے پوتے تھے۔ بنیاؔ جب پانچ سال کے ہوئے کہ مرض چیچک سے آنکھیں خراب ہوگئیں اور بصارت جاتی رہی۔ اسکے باوجود موصوف نے زبانی تجوید اور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ صغیر سنی میں پ کا سایہ سر سے اٹھ جانے اور ہندوستانی حکومت کے قانون کے تحت زمینداری چھن جانے کی وجہ سے بنیاؔ کو سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر میں بس تلاوت کلام اللہ اور شعر و سخن سے شغف تھا۔ اس میں کسی استادِ فن سے تلمذ حاصل نہیں کیا تاہم کلام صاف اور با محاورہ ہے۔ اردو کے موقر رسائل میں اکثر کلام شائع ہوتا تھا۔

نمونہ حسب ذیل ہے :-

اے پیر مغاں کیسی یہ مے مجھے پلوائی ✻ بیہوش ہوں بے خود ہوں سرشار ہوں شیدائی

جب دل میں تصور ہے تصویر کی کیا حاجت ✻ کیوں چشم حقیقت ہو منت کش بینائی

شفتگیٔ دل نے رسوا کیا عالم میں ✻ کیسی یہ قیامت ہے بنیاؔ ہوا سودائی

علاج جراحت دل ہی دل زار کو بتائے ✻ د گلا کرے نہ بکا کرے نہ دعا کرے نہ دوا کرے

بنّو دہلوی

بنّو نام اور بنّو ہی تخلص تھا۔ دلّی کی رہنے والی تھی۔ نہایت خوبصورت، جادو بیان، سراپا ناز و شوخ و طناز تھی۔ دلّی ہی کے ایک خوبصورت اور زود گو شاعر گلاب سنگھ آشفتہ سے اس کی شناسائی ہوگئی تھی۔ رابطہ اتحاد جانبین بہ درجۂ کمال تھا۔ آشفتہ کو اپنی محبوبہ بنّو سے دوری اس درجہ شاق تھی کہ اس نے اپنے گلے پر خنجر پھیر کر خود کو ہلاک کر لیا۔ جب اس شاہد عاشق مزاج کو اس حادثۂ جاں کاہ کی خبر ہوئی تو بہت غمگین و پریشان ہوئی۔ فی الفور زبان پر یہ شعر لائی ؎

بچتا نہیں ہے کوئی بھی بیمار عشق کا
یارب نہ ہو کسی کو یہ آزار عشق کا

بنّو پر اپنے عاشق کی اس طرح خودکشی کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اس نے اسی روز سے لہو لعب اور منشیات کے استعمال سے توبہ کر لی اور گوشۂ تنہائی اختیار کر لی۔ غالب کا یہ شعر اس کے حسب حال ہوا ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آشفتہ کی جدائی نے جلد ہی اثر دکھایا۔ غم کی زیادتی سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ بنّو کو تپ رہنے لگا۔ بالآخر انجام وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ بنّو مرض دق میں مبتلا ہوئی اور آشفتہ کی موت کے کچھ ماہ بعد خود بھی راہیٔ ملک عدم ہوگئی۔

نمونۂ کلام:

میں تپ غم سے جلوں اور یہ کریں دق کا علاج
ہو سمجھ اُلٹی طبیبوں کی تو کیا اس کا علاج

؎ چھوڑ کر مجھ کو کہاں لے بتِ گم راہ چلا
تو چلا کیا کہ یہ دل بھی ترے ہمراہ چلا

؎ نہ تو موت آتی ہے نے زیست کا یارا مجھکو
ہائے آشفتہ ترے مرنے نے مارا مجھکو

غزل

موت پر بس نہیں چلتا ہے کروں کیا ورنہ
تو نہیں ہے تو نہیں زیست گوارا مجھ کو

اب کسے چین ، کہاں عیش ، کدھر بسترِ خواب
نہیں مخمل بھی کم از بسترِ خارا مجھ کو

کیا ہوئی ہائے فغاں کی تری شور انگیزی
نے چلے تجھ کو تو تو نے نہ پکارا مجھکو

لاشِ آشفتہ کو بے رحموں نے پھونکا آگ سے
آتشِ غم بھی جوانا مرگ کی کچھ کم نہ تھی

بہترؔ رائے بریلوی

سیدہ خیر النساء نام ، بہترؔ تخلص تھا ۔ یہ رائے بریلی کے خانوادہ شاہ علم اللہ کے ممتاز رکن سید شاہ ضیاء النبی کے گھر ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوئیں ۔ ان کے آباؤ اجداد زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔ نہایت دین دار ، متقی اور خادم قوم و ملت تھے ۔ محترمہ بہترؔ صاحبہ مولانا حکیم سید عبدالحئی مصنف گل رعنا و ناظم ندوۃ العلماء کی شریک حیات اور عالم اسلام کی ممتاز شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کی والدہ ماجدہ تھیں ۔

نیک طینت ، پاک سیرت ، عبادت گزار ، عاشق رسول ، خادمہ دین و ملت ، پیکر علم و عمل ، عالمہ ، ادیبہ اور شاعرہ تھیں ۔ سارا خاندان "ہمہ خانہ آفتاب است" کے مصداق تھا ۔ ملک کے ممتاز و جید علماء مشہور شاعر و ادیب اکثر ان کے ہاں مہمان ہوتے تھے ۔

قدیم زمانے میں مستورات کے لیے تعلیم حاصل کرنے کا عام رواج نہ تھا ۔ لڑکیوں کی تعلیم امور خانہ داری اور مذہبی معلومات حاصل کرنے کی حد تک محدود تھی ۔ بہترؔ صاحبہ نے بھی خانگی طور پر فارسی اور اردو کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی ۔ بہ ایں پابندیوں اور محدود اجازت کے باوجود سخت محنت اور کوشش سے علم و ادب کی وہ خدمت انجام دے گئیں جس کی مثال حلقۂ خواتین میں بہت کم ملتی ہے ۔ انھیں قدرت کی طرف سے غیر معمولی حافظہ اور موزونیت عطا ہوئے تھے ۔ بہترؔ صاحبہ نے تین سال کی چھوٹی سی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا ۔ وہ فطری شاعرہ بھی تھیں ۔ ان کا کلام اللہ تعالیٰ پر مکمل اعتماد ، والہانہ عشق رسولؐ ، بے خودی و سرشاری ، اور لذت و سرور کی اعلیٰ خصوصیات سے سرشار رہتا ۔ ساری شاعرانہ صلاحیتیں حمد و نعت اور مناجات کے

سے لیے وقف کردی تھیں، ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "باب رحمت" ۱۹ء میں شائع ہوا تھا جو بعد میں مزید اضافے ساتھ "کلید باب رحمت" کے نام سے ۱۹۵۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ آخری ایڈیشن بہتر صاحبہ کے انتقال کے ایک سال بعد ۱۹۶۱ء میں مکتبۂ اسلامیہ لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

بہتر صاحبہ نے ۱۹۴۳ء میں مبلغ اسلام مولانا شاہ محمد الیاس کاندھلویؒ سے شرف بیعت حاصل کیا۔ موصوف کے وصال کے بعد محترمہ نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے سر تجدید بیعت کی۔ ۱۹۴۶ء میں افراد خاندان کے ساتھ حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کیا۔ آخری عمر میں تقریباً معذور ہوگئیں تھیں مگر اس کے باوجود نماز کی پابندی، تہجد گزاری، ذکر الٰہی، تلاوت قرآن مجید اور نوافل میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ بالآخر ۳۱ اگست ۱۹۶۰ء کو یہ باہمت اور پاک طینت خاتون (۹۰) نوے سال کی عمر میں اللہ کو پیاری ہوگئیں مرحومہ کے کلام کے کچھ نمونے پیش خدمت ہیں۔

جو مانگا ہے، جو مانگیں گے خدا سے ہم وہی لیں گے
مچل جائیں گے، اڑ دیں گے خدا سے ہم وہی لیں گے

نہیں دشوار کچھ تجھ کو جو تو چاہے ابھی دے دے
کہ ہم محتاج تیرے ہیں جو تو دے گا وہی لیں گے

ترا فضل و کرم، تیری عنایت دیکھ کر اس دم
رہیں گے پھر نہ ہم چپ یوں، کہیں گے ہم ابھی لیں گے

نہیں گو ہم کسی قابل، مگر تیری عنایت ہے
جو تیری شان کے لائق ہے ہم تجھ سے وہی لیں گے

اری بہتر نہ تو گھبرا جو مانگے گی وہ پائے گی
کہے گی جب تو گھبرا کر کہ ہم اس دم یہی لیں گے

مایوس نہ ہو اے دل دستِ دعا اٹھا کر
پھیرے گا وہ نہ خالی در سے تجھے بلا کر
تھم جا ذرا نہ گھبرا، ابرِ کرم ہے چھایا
آئے گا تھم تھما کر، برسے گا جھم جما کر
ضائع نہیں وہ کرتا محنت کبھی کسی کی
دے گا ضرور اک دن مانگو تو گڑگڑا کر

رہنا کبھی نہ غافل دم بھر بھی اس سے بہتر
ہر دم خدا خدا کر، ہر دم خدا خدا کر

تیری رحمت کی کبھی ہم پہ نظر ہوگی ضرور
نہ رہے گی شبِ تاریک سحر ہوگی ضرور
یہ کشش ایسی نہیں ہے کہ نہ ہو اس کا اثر
سر جو رکھا ہے ترے در پہ خبر ہوگی ضرور
جب کہ عالم پہ تری چشمِ عنایت ہوگی
اس گھڑی چشمِ کرم تیری ادھر ہوگی ضرور
ایک چھینٹا تیری رحمت کا اگر پڑ جائے گا
آج سوکھی ہے زمیں تو کل یہ تر ہوگی ضرور

رکھ تو امید خدا سے یہی بہتر ہر دم
تیری امداد یہاں شام و سحر ہوگی ضرور

نہیں ہے بہتر کو اب گوارا کہ دل ہو یاروں کا پارہ پارہ
ملے وہ گھر جس میں لطف ہے، کرم بھی ہے اور وصال بھی ہو

ہم سے خوش ہو جو خداوندِ جہاں اے بہتر
خواہشِ خلد نہ ہم نار کا ڈر رکھتے ہیں

زباں میں یا الٰہی وہ اثر دے
کہ جو چاہوں میں تجھ سے تو وہ کر دے

بیخودؔ دہلوی

سید وحید الدین نام، بیخودؔ تخلص وحید العصر خطاب تھا۔ آپ ۱۳ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۰ء کو ہندوستان کی قدیم ریاست بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ نجیب الطرفین سید ہونے کی وجہ سے آپ کا سلسلۂ نسب شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے ملتا ہے۔ آپ کی ددھیال و ننھیال کے بزرگ بے مثال انتظامی صلاحیت اور قابلیت کی وجہ سے مغلیہ بادشاہوں کے دور میں اور اس کے بعد ہندوستانی ریاستوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

بیخودؔ کو شاعری کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ آپ کے دادا سید بدر الدین احمد عرف فقیر صاحب۔ سالکؔ و کاشفؔ تخلص کرتے تھے اور مرزا غالبؔ کے تلامذہ میں شامل تھے۔ والد سید شمس الدین احمد عرف سید احمد سالمؔ کو بھی شاعری سے غیر معمولی شغف تھا۔ دونوں چچا موزوںؔ اور فردؔ کے علاوہ تینوں ماموں منشی کرم اللہ خاں شیداؔ، حکیم عبداللہ شیداؔ اور مولوی عبد الرحیم خاں بیدلؔ بھی شاعر تھے۔

بیخودؔ کی والدہ کے پھوپھا صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہؔ مشہور سخنور و سخن سنج تھے۔ خود بیخودؔ نے لال قلعہ کی ایک بیگم کی آغوش میں تربیت پائی تھی اس طرح بیخودؔ نے ناز و نعم اور عیش و عشرت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اور سنِ شعور کو پہنچے۔

بیخودؔ کی تعلیم واجبی تھی مگر قدرت نے انھیں طبع موزوں اور ذہن رسا عطا کیا تھا۔ موصوف نے درس گاہِ سخن میں داخل ہو کر رشتۂ نظم کے موتی پروئے ہیں۔ اور تمام اصنافِ سخن میں جولانیِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں آپ کے

کلام میں برجستگی اور شگفتگی وافر مقدار میں موجود ہے۔ زبان کی موثر ترجمانی اور زبان و بیان پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ ابتدا میں کسی سے تلمذ حاصل کیے بغیر شعر کہتے تھے۔ بعد میں مرزا داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا جس کی وجہ سے فنِ شعر کی خوبیوں میں جلد عبور حاصل ہو گیا۔ شفیق استاد کی توجہ اور ہمہ وقت ادبی صحبتوں کے فیض سے کلام میں جلد پختگی اور اثر پیدا ہو گیا۔

بے خود نے داغ دہلوی کا اس درجے تتبع کیا کہ داغ اور بے خود کے اکثر اشعار میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ "گفتارِ بیخود" اور "درِ شہوارِ بیخود" اس کی بہترین مثال ہیں۔ خود داغ دہلوی بیخود کے کلام سے اس قدر مطمئن اور خوش تھے کہ بیخود کی زبان کو اپنی زبان کہتے تھے۔ اسی جذبے کے تحت داغ مرحوم نے بیخود کو "وحید العصر" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ بیخود بھی تمام عمر داغ سے شرفِ تلمذ پر مفتخر رہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

زباں استاد کی بیخود ترے حصے میں آئی ہے
پھر اتنا بھی نہیں کوئی خدا رکھے ترے دم کو

شاعری میں دلی کی ٹکسالی زبان، محاورات اور روزمرہ کا استعمال جس اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اسی وجہ سے انہیں داغ ثانی بھی کہا گیا ہے اور تمام اساتذہ فن نے انھیں داغ کا صحیح جانشین تسلیم کیا ہے۔

بیخود کا کلام اس زمانے کے مشہور و معیاری اردو جرائد ساقی دہلی اور "مخزن" لاہور میں شائع ہوتا تھا۔ موصوف نے اپنی غیر معمولی صلاحیت موزونیت اور فنی مہارت کا لوہا منوا کر ہر دل عزیزی اور شہرت حاصل کی اور بہت جلد استادی کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ تلامذہ کی کثیر تعداد نے جن میں مسلم و غیر مسلم دونوں شامل تھے۔ ان سے کسب فیض کیا۔ ان میں نواب قطب الدین احمد فطین۔ ابن رشا، مخمور دہلوی۔ آغا حیدر حسن قدر، لالہ ﷲ لال جوہری، لالہ

ڈاکٹر مبین احمد سرشار، لالہ شنکر لال شنکرؔ، لالہ مرلی دھر شادؔ اور کیلاش رام شررؔ کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

بیخودؔ خوش پوشاک اور خوش خوراک ہونے کے علاوہ شاہ خرچ بھی واقع ہوئے تھے۔ ادھر کہیں سے کچھ آیا اُدھر انھوں نے خرچ کر ڈالا۔ آخری عمر میں بیماری اور کمزوری کی وجہ سے مشاعروں میں شرکت کرنا چھوڑ دیا تھا جن سے کچھ یافت ہو جاتی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ایک سو پچاس روپے ماہوار مولانا ابوالکلام آزاد وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند کی طرف سے دیتے تھے۔ ان کے مالدار شاگرد لالہ شنکر لال اور مرلی دھر شادؔ بھی ان کی مالی مدد کرتے رہتے تھے۔ بس اب ان کا زیادہ وقت یادِ اللہ اور فکرِ سخن میں گزرتا تھا۔ بالآخر گلدستۂ زبانِ اُردو کا یہ خوش نما پھول ۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو زندگی کی ستانوے بہاریں دکھا کر مرجھا گیا۔ نواب مرزا داغؔ کا یہ چہیتا شاگرد اور دلّی کی ٹکسالی زبان کا آخری تاجدار سخن دنیائے شعر و سخن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منہ موڑ گیا ؎

زندہ تھا بیخودؔ کے دم سے نام داغؔ و میرؔ کا
آج رخصت ہو گیا وہ خانماں برباد بھی

بیخودؔ کے کلام سے منتخب اشعار اور چند غزلیں پیشِ خدمت ہیں ؎

؎ مٹ جائیں مگر ساتھ نہ چھوڑیں گے ترا ہم
عاشق ہیں تو بن جائیں گے نقشِ کفِ پا ہم

؎ ہم نے کی عشق سے تعلیم فنا کی حاصل
دردِ الفت کو ہر اک درد کا درماں سمجھے

؎ یہ حسنِ انتخاب ہے یا انتخابِ حسن لاکھوں میں دیکھتا ہوں الگ چھٹ گیا کوئی

ے چوٹ کھا کر ہی تو انسان بنا کرتا ہے
دل تھا بے کار اگر درد نہ ہوتا پیدا

ے طلب کرتے ہیں کیوں کر مال و دولت سے یہ پوچھوں گا
مجھے تو مانگنا تک بھی نہیں آتا وہ سائل ہوں

ے جب ملے جس سے ملے، دل کھول کر دل سے ملے
اس سے بڑھ کر اور خوبی کوئی انساں میں نہیں

ے ہاں کو اتنا کھینچتے کیوں ہو خدا کے واسطے
پھر تو اس وعدے کا مطلب دوسرا ہو جائیگا

غزل

بے وفا کہنے سے کیا لے بے وفا ہو جائے گا
تیرے ہوتے اس صفت کا دوسرا ہو جائیگا

شرط کر لو پھر مجھے برباد ہونا بھی قبول
خاک میں مل کر تو حاصل مدعا ہو جائے گا

سینہ توڑا، دل میں چٹکی لی، جگر زخمی کیا
کیا غضب تھی تیر بھی تیری ادا ہو جائیگا

آنکھ سے ہے وصل کا اقرار دل دیتا ہے
تم زباں سے اپنی کہہ دو گے تو کیا ہو جائے گا

اس نے چھیڑا تھا مجھے تم جان دو گے کب ہمیں
کہہ دیا میں نے بھی جب وعدہ وفا ہو جائیگا

یوں سوالِ وصل پر ٹالا گیا برسوں کوئی
صبر کر مضطر نہ ہو، تیرا کہا ہو جائے گا

توبہ بھی کر لی تھی یہ بھی نشہ کی تھی اک ترنگ
آپ سمجھے تھے کہ بیخود پارسا ہو جائے گا

غزل

جاں یوں عشق میں اربابِ وفا دیتے ہیں
یہ تماشا بھی تجھے آج دکھا دیتے ہیں

کیا کہوں ذکر جو دشمن کے مزا دیتے ہیں
یہ تو مجھ کو بھی مرے دل سے بھلا دیتے ہیں

پوچھیئے خارِ تمنا کی خلش کو دل سے
یہ وہ کانٹے ہیں کھٹکنے میں مزا دیتے ہیں

دل کا سودا تو نگاہوں میں پٹا کرتا ہے
کس کو معلوم ہے کیا لیتے ہیں کیا دیتے ہیں

میری عادت سے ابھی آپ نہیں ہیں واقف
وعدے کے ساتھ تجھے یہ بھی سنا دیتے ہیں

مانگ کر بوسہ پڑے لینے کے دینے ہم کو
کس نے منہ پھیر کے چپکے سے کہا دیتے ہیں

او ستم کیش و جفا کار تری عمر دراز
مرنے والے تجھے جینے کی دعا دیتے ہیں

ایک بوسہ پہ تو سودا نہ پٹے گا دل کا
سوچ کر دیجیے کچھ آپ یہ کیا دیتے ہیں

رات یہ اور بھی فرقت میں گزارو بیخود
صبح ہو جائے تو ہم ان کو بھلا دیتے ہیں

پیرا دہلوی

پیر علی نام اور پیرا تخلص تھا۔ یہ قطعی حرف ناشناس اور ذات کا بہشتی تھا یہ شرف صرف دلی و لکھنؤ کو حاصل تھا کہ اس سے ایسے ایسے ذہین اور موزوں سخن اشخاص پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ناخواندگی اور کم علمی کے باوجود زمین سخن میں فرحت بخش چمن آرائیاں کیں۔ پیرا اگرچہ علم سے قطعی کورا تھا مگر موزوں طبع تھا۔ مجرم دہلوی کی حوصلہ افزائی اور تربیت نے اسے شعر موزوں کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ بعض اشعار حسنِ تخیل اور لطافتِ زبان کی وجہ سے پسند بھی کیئے گئے مگر یہ اپنے جہل اور لاپرواہی کی وجہ سے انہیں محفوظ نہ رکھ سکا۔ نمونے کے طور پر تین اشعار درج کیے جاتے ہیں جو مختلف تذکروں میں درج ہیں ؎

تاکتے پھرتے تھے پہلے تو بتوں کو پیرا
گھر میں بیٹھے ہوئے اب یادِ خدا کرتے ہیں

بھلا پیرا کا دل بہلے گا کیوں اب چھوڑ دہلی کو
اسے جنت میں بھی دلی کی گلیاں یاد آئیں گی

شوقِ گریہ کو کہو روئیے کس پاس کہ اب
نام کو بھی نہ رہا آنکھ میں قطرہ باقی

پیکؔ دہلوی

پیک نام اور پیکؔ ہی تخلص تھا۔ مولد و مسکن دہلی تھا۔ خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ ابو محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں چوبداری کی خدمت پر مامور تھا۔ بہادر شاہ خود ایک اچھے شاعر تھے اور فن شعر پر غایر نظر رکھتے تھے۔ اہل کمال کے لیے داد و دہش کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اگرچہ خود ان کی حکومت کا نیّر آفتاب غروب ہو رہا تھا اور حکومت لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی، تاہم اقلیم شعر و سخن کو عروج حاصل تھا۔ عروس البلاد دہلی میں تمام ہندوستان کے بیشتر باکمال اساتذہ سخن دادِ سخن دے رہے تھے۔

پیکؔ کو لال قلعہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں سے لُطف اندوز ہونے کے مواقع میسّر آتے تھے اگرچہ الف کے نام ب نہیں جانتا تھا مگر چونکہ قُدرت کی طرف سے طبع موزوں عطا ہوئی تھی اس لئے شاہی توسل اور شرفاء دہلی کی صحبتوں نے طبیعت کو شاعری کی طرف مائل کر دیا تھا۔ پیکؔ وقتاً فوقتاً اپنے جذبات و کیفیات کو شعر کی صُورت میں اظہار کرنے لگا اور بغیر اُستاد کے مشق سخن جاری رکھی۔ اُمّی ہونے کی وجہ سے اپنا ما فی الضمیر ضبط تحریر میں نہیں لا سکتا تھا۔ اس لئے سارا کلام ضائع ہو گیا۔ معروف تذکروں سے صرف تین اشعار دستیاب ہوئے ہیں جو درج کیے جاتے ہیں :-

؎ اب تو غم کھاتا ہوں میں اے ہمنشیں
دیکھنا پھر غم مجھے کھا جائے گا

؎ پیکؔ اس کوچہ میں نہ لے جا آرزو
دن دہاڑے قافلہ لُٹ جائے گا

؎ شوق میں چُپکے سے آتا ہوں تیرے کوچہ میں
مجھ سے لیتی ہے صبا تیزیِ رفتار کو دام

پارسا جے پوری

عبدالرحمٰن عرف بندو خان نام اور پارسا تخلص تھا۔ غدر سے قبل پرگنہ کوٹ قاسم میں تعینات تھا۔ بعد میں جے پور میں سکونت اختیار کر لی۔ نگینہ سازی کا کام کرتا تھا۔ نہایت شریف اور ملنسار شخص تھا۔ شاعری سے دلی رغبت تھی۔ اس فن میں اصلاح و تربیت کے لیے پارسا، ممتاز عالم دین و نام ور سخنور مولانا کوثر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے شرفِ تلمذ کی درخواست کی مگر انہوں نے اس کے جہل ہی کی وجہ سے شاگرد بنانے سے انکار کر دیا۔ پارسا بھی بڑا ضدی تھا۔ آٹھ سال تک کوثر جے پوری کے پیچھے پڑا رہا۔ بالآخر موصوف نے اسے حلقۂ تلامذہ میں شامل کر لیا اور اس پر توجہ بھی فرمائی۔ پارسا نے سخت محنت اور استاد کی اصلاح سے اپنے کلام کو مزین کیا اور مشاعروں میں شرکت کر کے خوب داد و تحسین، انعامات اور تمغے وصول کیے۔

چند اشعار بمشکل دستیاب ہوئے ہیں جو بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

داغِ دل، داغِ جگر، داغِ تمنا لے کر
ہم چلے انجمنِ یار سے کیا کیا لے کر

آ گیا تھا راہِ الفت اک ایسا بھی قدم
ڈھونڈتا پھرتا رہا منزل کو میں منزل مجھے

تارِ نفس تو ہے ابھی اے بخیہ جنوں
دامن نہیں تو کیا جو گریباں نہیں تو کیا

کبھی ستم بھی خوشی سے اٹھا لیے ہم نے
کبھی کرم بھی تمہارے بہت گراں گزرے

پسند دہلوی

مرزا لطیف بیگ نام اور پسند تخلص تھا۔ دلی میں پیدا ہوا۔ اور تمام عمر اسی کے گلی کوچوں میں بسر کر دی۔ بہت معمولی لیاقت کا آدمی تھا۔ تاہم شعر گوئی کا بیحد شوق تھا۔ اس نے سخت کوشش سے مصحفی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جس سے کلام میں صفائی پیدا ہو گئی اور پسند کے اشعار پسند کئے جانے لگے۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

میں اسیر غم کہاں اور کوچہ قاتل کہاں
یہ نہیں معلوم جا کر دل ہوا گھائل کہاں

جانتے تھے تیرے ہاتھوں سے تھے نالاں کتنے
دل دیا ہم نے تجھے، ہم بھی تھے ناداں کتنے

صرف شکوہ کا لب پہ لانا پسند
کام عاشق کا جاں نثاری ہے

تحیّر دہلوی

غلام مصطفیٰ نام اور تحیّر تخلص تھا۔ یہ فاضلِ بے مثل و جامع علم و عمل مولانا شاہ محمد رفیع الدین کے صاحبزادے اور مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کے بھتیجے تھے۔ ان کے خاندان کی بزرگی اور علمی شہرت محتاج بیان نہیں، مگر یہ میراثِ پدری سے بالکل محروم رہے اور علم حاصل نہیں کیا۔ شعر گوئی کا البتہ شوق تھا۔ اس فن میں حکیم ثناء اللہ خان فراق سے تلمذ تھا۔ موزونی طبع کی وجہ سے فکرِ سخن کرتے تو استاد کی اصلاح سے اسے مزین کر لیا کرتے تھے۔

نمونۂ کلام حاضر ہے ؎

؎ عید کے دن مجھے کہنے یہ ہر اک یار لگا
ہو مبارک تری چھاتی سے وہ دلدار لگا

؎ جدا مجھ سے جب وہ دل آرام ہوگا
اجل کا اسی وقت پیغام ہوگا

؎ نکر اطفال کو ہے سنگ اٹھا لانے کی
آمد آمد ہے شاید ترے دیوانے کی

تصویر دہلوی

غلام احمد خاں نام اور تصویر تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے اور میاں بتن کے نام سے مشہور تھے۔ الف کے نام ب نہیں جانتے تھے۔ مگر لیلائے سخن پر بری طرح نثار تھے۔ پہلے خدا بخش خان تنویر کے شاگرد ہوئے۔ بعد ازاں خاقانی ہند محمد ابراہیم ذوق سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ بڑے پرگو اور زود گو شاعر تھے۔ کلام ایسا پاکیزہ ہوتا کہ سن کر بڑے بڑے استادوں کے سر ہل جاتے تھے۔ کلام سن کر تو معلوم ہی نہ ہوتا کہ ایک اُمّی پڑھ رہا ہے۔ بس "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کی بہترین مثال تھے۔ جب کچھ کہنا ہوتا کسی پڑھے لکھے راہ گیر کو پکڑ لیتے اور کہتے بھائی ذرا یہ لکھتا جا" آخر عمر میں دیگر اہل فن کی طرح یہ بھی دہلی سے ریاست الور چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ لیجیے ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے اور فن کی داد دیجیے۔

ہجر کی شب تو سحر ہو یا رب — وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جان بے کار تو اپنی نہ گئی — اے ستمگر تری شہرت ہی سہی
مجھ سے اتنا بھی نہ کھینچیے صاحب — آپ پر میری طبیعت ہی سہی
جذبۂ دل نہیں لایا تم کو — آپ کی غیر عنایت ہی سہی

تصویر کی ایک اور غزل ملاحظہ کیجیے

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں کیا لگی — پہلو سے دل میں دل سے کلیجے میں جا لگی
دامن پہ وہ لگے نہ رکھے دلربا لگی — لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

میں نے کہا عدو پہ تو عاشق بھی ہو گیا
ہنس کر کہا کہ آپ ہی کی بددعا لگی

بس بس خرام ناز کہ محشر بپا ہوا
پلنے تمہاری چال سے خلق خدا لگی

متفرق اشعار

؎ بات بھی کچھ اس نے کی تو ذکر دشمن کا کیا
وائے قسمت وہ کھلا ہم سے بھی تو کیونکر کھلا

؎ کہتے ہو فرصت ہوئی ہم کو تو آئینگے ضرور
میری جاں یہ بھی کوئی انداز ہے اقرار کا

؎ جاں بہ لب تھا تو عیادت کو بھی آجاتے تھے
میں تو لو اور بُرا ہو گیا اچھا ہو کر

؎ وفا کی ہم نے تم سے اور تم نے غیر سے اب تک
طریقِ عشق سے باہر نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

؎ مجھ کو وہاں بلائیے یا آپ آئیے
اپنی تو ہے وصال تمنا کہیں سہی

؎ تصویر تم پہ جان ہی دے دیگا ایک دن
ہم کو تو اعتبار ہے تم کو نہیں نہ ہو

تنہا دہلوی

انکا نام اور تنہا تخلص تھا۔ دہلی کے بازار سرکی والان میں گوشت کی دکان تھی۔ عمدہ گوشت بیچنے کی وجہ سے دہلی کے مال دار اور متوسط طبقے کے لوگ زیادہ تر انہی سے گوشت خریدتے تھے اس طرح عمدہ گوشت خریدنے کے ساتھ ساتھ انھیں انکا کلام سننے کو مل جاتا تھا۔ بکری زیادہ ہونے کی وجہ سے مالی حالت اچھی تھی۔ ادنیٰ پیشے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تعلیم سے بالکل بے نیاز رہے۔ دہلی کے شرفاء کی صحبت میں رہ کر ادب آداب سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ شوق اور محنت سے شعر موزوں کرتے تھے۔ اپنے دور میں اچھا کہنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیجیے تنہا کی ایک غزل ملاحظہ کیجئے ؎

تاب گہر تو پہنچے نہ دنداں کی آب کو — اور لب کریں خجل ترے برگ گلاب کو
دے دیجیے وصلِ یار کا مژدہ بتاؤ تو — بہلائیں کب تلک دلِ خانہ خراب کو
اب نامہ بر بنائیں تجھے ناصح کوچے میں ہے — معقول آدمی تو ہو کوئی جواب کو
کیا آئی اے اجل ؟ جو نہ آئی شب فراق — آنکھیں ترس رہی ہیں مری کب سے خواب کو

تنہا اسی گلی میں جو مر جاؤ خوب ہے
آخر تو چھوڑنا ہے جہانِ خراب کو

انکا ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے ؎

مژگاں سے گزرے تو نگاہ نے کیا شکار — برچھی اک اور تھی تہ خنجر چھپی ہوئی

انکا نے اس شعر میں برچھی اور خنجر کے الفاظ استعمال کر کے اپنے پیشے کی مناسبت قائم رکھی ؛ ایک خواندہ شاعر یہی بات کہتا تو اس سے بہتر کیا کہہ سکتا تھا۔

تمیزؔ رامپوری

رام دیال ولد خالی رام نام، تمیزؔ تخلص۔ یہ قوم کا تمبولی ہندو تھا ۱۲۳۲ھ میں ریاست رام پور کے محلہ گوجراں میں پیدا ہوا۔ معمولی لیاقت کا آدمی تھا۔ فن شعر گوئی میں پہلے میاں نظام شاہ سے رجوع کیا۔ بعد ازاں نواب مرزا خاں داغؔ کے تلامذہ میں شامل ہو گیا۔

کہتے ہیں تمیزؔ نے ایک رات راستے میں ایک ایسی صورت دیکھی جس سے صبر و قرار جاتا رہا اور دیوانگی بڑھتی گئی مگر انہیں اس کے بعد اس پری پیکر کی صورت دیکھنے میں نہیں آئی۔ ان کا یہ حال دیکھ کر نظام شاہ علاج کیلئے انھیں رام پور کے ایک صاحب کمال بزرگ میاں احمد علی شاہ کے پاس لے گئے۔ یہ ان کی صورت دیکھتے ہی مسلمان ہو گیا۔ اور اسلامی نام غلام احمد رکھا گیا۔ یہ عبادات اور ذکر و اذکار میں ہمہ تن مشغول رہتا۔ اپنے پیر و مرشد کی خدمت اور ان کے حکم کی پیروی کے سوا کسی دوسرے کام سے سروکار نہ رکھتا۔ خود ایک جگہ کہتے ہیں ؎

تمیزؔ اب ہو گیا یکساں ہمارا ظاہر و باطن
سیاہی دل کے اندر تن پہ بھی پوشاک کالی ہے

انھیں حج و زیارت حرمین شریفین کا شوق پیدا ہوا مگر زاد راہ مفقود تھا لہٰذا ریاست حیدرآباد جا کر محکمہ مال میں ملازمت اختیار کر لی۔ جب حج کے لیے اخراجات جمع ہو گئے تو حج کی سعادت سے مشرف ہوا۔ سفر حج کی نسبت اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں ؎

ناز تقدیر پہ ہو کیوں نہ خدایا مجھ کو
کہ محمدؐ نے مدینے میں بلایا مجھ کو

تنگ دستی کی چلی پیش نہ کچھ ضعف کا زور
پر لگا کر مری قسمت نے اڑایا مجھ کو

حج سے واپسی پر تمیزؔ رام پور کے محلے کھنڈ ساقدیم میں سکونت پذیر ہوگئے۔ یہ زندگی بھر کنوارا رہا۔ ہزاروں لوگ مرید تھے۔ اکسٹھ (۶۱) برس کی عمر میں ۳ رجادی الآخر ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں رام پور میں انتقال ہوا۔ آرزو کے مطابق تمیز کو ان کے پیر و مرشد میاں نظام شاہ کے مزار کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

تمیز کا ایک عشقیہ دیوان اور ایک نعتیہ دیوان اور ایک مثنوی جس میں اپنے مسلمان ہونے کا حال اور بزرگان کا سلسلہ درج ہے تمیز کے سجادہ نشین کے پاس ہنوز موجود ہے۔ موصوف کے ایک مرید نے یہ تاریخ وفات کہی ہے جو ان کی قبر کے پتھر پر کندہ ہے ؎

تھے جو وہ حاجی غلام احمد تمیز — صوفی و صافی و عالی منزلت
ہو گئے جس دم نہاں زیر زمیں — ایک عالم آیا بہر تعزیت
سال رحلت ہے یہ کہ پوچھے کوئی — ڈوبا ہے آفتاب معرفت

تمیز کی ایک غزل پیش کی جاتی ہے ؎

نذر دینے جو گیا میں دل شیدا لے کر — بولے بس جاؤ بھی تم آئے ہو یہ کیا لیکر
رہ گیا تھام کے ہاتھوں سے کلیجہ اپنا — جس حسیں نے تری تصویر کو دیکھا لیکر
شکوۂ جور و جفا پہ مجھے فرماتے ہیں — جاؤ بھی آئے ہو کیا مفت کا جھگڑا لیکر
اچھے منصف ہو کہ لے خواب میں بوسہ کوئی — اور بدنام کرو نام ہمارا لے کر
تم پہ قربان سبھی لفظ ہیں قیمت دل کی — پھر اسی ناز سے کہہ دو کہ کریں کیا لیکر
شرم آتی ہے مجھے ایسے مرنے سے تمیز
جاؤں کیا پیش خدا جنت کی تمنا لے کر

تسنیم رائے بریلوی

امۃ اللہ تسنیم ممتاز شخصیت و مقتدر عالم دین مولانا سید عبدالحئی صاحب کی صاحبزادی تھیں۔ خاندان والے انہیں عائشہ بی بی بھی کہتے تھے۔ بروز جمعہ ۵ جون ۱۹۰۸ء کو رائے بریلی کے تکیہ شاہ علم اللہ میں پیدا ہوئیں گھریلو تعلیم اپنی والدہ ماجدہ محترمہ خیر النساء اور خاندان کے دیگر بزرگوں سے حاصل کی۔ خانوادہ علم و ادب سے تعلق کے سبب علمی مشغلہ دینی ذوق اور موزونیت طبع ان کو ورثہ میں ملے تھے ۱۹۲۶ء میں ماموں زاد بھائی مولانا سید ابوالخیر حسنی کی شریک حیات بنیں۔ تین اولادیں ہوئیں جو سب بچپن ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ سترہ سال کی رفاقت کے بعد شوہر بھی داغ مفارقت دے گئے۔ موصوفہ کا اب سارا وقت عبادت و ریاضت، دعا و مناجات، دینی اجتماعات، فلاحی کاموں اور علمی و ادبی مشاغل میں گزرنے لگا۔ نہ صرف خاندان کی بچیوں نے ان سے دینی تعلیم و تربیت حاصل کی بلکہ علاقہ کے مسلم گھرانوں کی خواتین نے موصوفہ سے کسب فیض کیا۔ آپ حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے مشرف بہ بیعت بھی تھیں ۱۹۴۷ء میں حج بیت اللہ و زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئیں۔ خواتین کی دینی و اخلاقی تربیت کے لئے موصوفہ نے ۱۹۵۶ء میں لکھنؤ سے ماہنامہ "رضوان" نکالا جس کی آخری وقت تک شریک مدیر رہیں۔

تسنیم صاحبہ کو شاعری کا ذوق فطری و موروثی تھا آپ کی والدہ محترمہ بہتر صاحبہ ممتاز شاعرہ تھیں جن کی نعتوں و مناجات کے مجموعے منظر عام پر آ کر اہل فن سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ تسنیم صاحبہ نے اپنی ساری شاعرانہ صلاحیتیں نعت و مناجات کے لئے وقف کر دی تھیں۔ آپ نے نعتوں کا مجموعہ "موج تسنیم" و "دیار حبیب" کے علاوہ دیگر دینی کتب حضرت رابعہ، بچوں کی قصص الانبیاء یادگار چھوڑی ہیں۔ جن سے

موجودہ اور آئندہ نسلیں ہمیشہ فیض یاب ہوتی رہیں گی۔

نمونۂ کلام :

حمد

تیری حمد مجھ سے ہو کیا بیاں تیری شان جل جلالہٗ | تیرا ذکر راحتِ قلب و جاں تیری شان جل جلالہٗ
تیری ذات اعلیٰ صفات ہے، تیرا نام آبِ حیات ہے | تیری یاد در رہِ نجات ہے تیری شان جل جلالہٗ
تو خبیر ہے تو علیم ہے تو لطیف ہے تو حلیم ہے | تو رؤف اور رحیم ہے تیری شان جل جلالہٗ
تیری حکمتوں کا ہو کیا بیاں تیری قدرتوں کی ہیں نشاں | یہ زمین اور یہ آسماں تیری شان جل جلالہٗ
تیرا فضل فضلِ عظیم ہے تیرا لطف عمیم ہے | تیری ذات ذاتِ کریم ہے تیری شان جل جلالہٗ

سلام کے چند اشعار :-

سلام اے رحمتِ عالم سلام اے نورِ ایمانی | سلام اے فخرِ آدم اور فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے مالکِ کوثر شفیعِ امتِ عاصی | سلام اے معدنِ لطف و کرم محبوبِ سبحانی
سلام اے رونقِ کعبہ سلام اے زینتِ طیبہ | سلام اے مظہرِ علم و ہدایت شمعِ ایمانی
کھلی قسمت کہ کاشانہ بنا گنجِ رسالت کا | زمیں کے بخت جاگے کی قبول اس نے جو مہمانی
تمنائے دلِ ہے مدینہ میرا مسکن ہو | وہیں جائے سکونت ہو وہیں پھر میرا مدفن ہو

مختلف نعتوں کے چند اشعار :-

رسولِ خدا خاتم المرسلین | حبیبِ خدا شافع المذنبین
مکمل ہوا جن پہ دینِ متین | منزل ہے جن پر کلامِ مبین

رموزِ الٰہی کے پیکر تھے وہ
خدا کے سوا سب سے بہتر تھے وہ

اک ایمان کی شمع اس نے جلادی + کہ تاریک خطہ کو جس نے جلادی
عرب کی زمیں نور سے جگمگا دی + جو بگڑی ہوئی تھی حالت وہ دم میں بنادی

گھٹا چھٹ گئی ظلمتِ شب کی ساری
ہوئے حق کے طالب بتوں کے پجاری

تاباںؔ دہلوی

دلی میں یوسف ثانی میر عبدالحئی تاباںؔ کے علاوہ مرزا شجاع الدین احمد خان تاباںؔ بھی مشہور سخن ور شمار کیے جاتے تھے۔ تاباںؔ کی تعلیم بھی دیگر رئیس زادوں کی طرح گھر پر ہی ہوئی۔ انھوں نے کسی درس گاہ سے تعلیم کی تکمیل کی سند حاصل نہیں کی۔ البتہ ذاتی شوق اور محنت سے معقول دست گاہ پیدا کرلی تھی یہ ۱۸۶۶ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ تاباںؔ تخلص تھا۔ اور فن سخن میں فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی سے تلمذ تھا۔ شاعری تاباںؔ کو ورثے میں ملی تھی۔ تاباںؔ کے والد نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ غوریبھی ایک اچھے شاعر تھے۔ دادا نواب ضیاءالدین احمد خان نیرؔ کا اپنے زمانے کے نامور شعرا میں شمار کیا جاتا تھا

تاباںؔ فکر معاش سے آزاد تھے۔ اس زمانے میں انھیں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اتنی ہی آمدنی خاندانی جائداد سے تھی۔ ایک سو ماہوار ریاست حیدرآباد سے ملتے تھے۔ بس انھیں دو ہی شوق تھے۔ فکر سخن کرتے یا شطرنج کھیلتے۔ تاباںؔ کے دوستوں میں حکیم اجمل خاں، حکیم عبدالمجید خاں نواب فیض احمد خاں، نواب سراج الدین احمد خان، خواجہ عبدالمجید، مولوی عبدالحق، (تفسیر حقانی والے)، اور پنڈت امرناتھ ساحرؔ شامل تھے۔ تاباںؔ بہت زندہ دل اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ اس لیے دیوان خانے میں ہر وقت اژدہام لگا رہتا تھا تاباںؔ ہر غریب و امیر سے خندہ پیشانی سے ملتے اور خاطر مدارات کرتے تھے۔

تاباںؔ کو البتہ غصہ بہت جلد آجاتا تھا۔ اکثر غصے میں جو منہ میں آتا کہہ بیٹھتے اور لوگ انھیں مخلص سمجھ کر گالیاں برداشت کر لیتے۔ حکیم اجمل خان تاباںؔ کے لنگوٹیے یار تھے۔ انھیں تاباںؔ کی ٹکسالی گالیاں اور دلچسپ فقروں میں کچھ ایسا لطف آتا کہ انھیں جان بوجھ کر چھیڑتے اور تاباںؔ حکیم صاحب کو وہ مغلظات

ستاتے کہ سننے والے کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے مگر حکیم صاحب کی تیوری پر بل تک نہیں پڑتا تھا۔ اگر کسی دن غصے کی وجہ سے تاباںؔ حکیم صاحب کے ہاں نہیں جاتے تو دوسرے دن شام کو حکیم صاحب خود تاباں کے ہاں پہنچ جاتے۔ تاباں خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے اور گلے لگا کر کہتے حکیم صاحب میں تمہیں یاد ہی کر رہا تھا خوب وقت پر آئے۔ آؤ شطرنج کی بازی ہو جائے تاباںؔ کو شعر گوئی سے فطری لگاؤ تھا۔ زود گو اور مشاق شاعر تھے۔ جملہ اصنافِ سخن میں قدرت رکھتے تھے۔ اس فن میں حسین علی خاں شاداںؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ بعدازاں فصیح الملک نواب مرزا داغؔ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل کر لیا۔ مرزا باقر علی خاں کاملؔ خلف متبنّیٰ حضرت غالبؔ کی بیٹی ان کی نکاح میں آئی تھیں۔

نمونۂ کلام حاضر ہے ؎

ہم نے سنا چکا ہے تاباںؔ کا مقدر
ذرہ وہ بنا نیرِ تابانِ حرم کا

؎

لیا ہے پہلے دل اب جان لے لے
کرے گا اور الفت آزما کیا

ابرو کی تیغ سے سرِ مقتل لٹا مجھے — مرجاؤں میں تو بن کے مسیحا جلا مجھے

تاباںؔ کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

؎

ارماں رہے نکل کے شبِ وصلِ یار میں — نکلے نہ دو سکے دلِ امیدوار میں
آئینے سے بھی رشکِ رقابت ہے کس لئے — وہ بھی دیکھتا ہے بناؤ سنگھار میں
ناستواریاں ترے وعدے کی بے وفا — ہیں استوار وعدۂ ناستوار میں
تو ہی بتا دے ناصحِ ناداں میں کیا کروں — دل اختیار میں ہے نہ وہ اختیار میں

پریشاں کر چکی ہیں میری آہیں
یہ ممکن ہے کہ وہ غیروں کو چاہیں

تلوّن ان کا شیوہ ہو گیا ہے
محبت ایک سے کیوں کر نبھائیں

کیا زخمی مرے دل کو جگر کو
چلیں ہیں تیر بن بن کر نگاہیں

نہ آیا راہ پر وہ شوخ ہم نے
نکالیں سیکڑوں ملنے کی راہیں

سہرا کہنے میں بھی تاباں کو قدرت حاصل تھی۔ حکیم اجمل خاں کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی حکیم محمود خاں خلف غلام کبریا خان سے ہوئی تو اس موقع پر غالب کے رنگ میں سہرا کہا تھا۔ سہرے کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

یوسفِ مصر بنا حسن کا پیکر سہرا
حورِ فردوس بنی نور کی چادر سہرا

مشتری زہرہ بہم آرسی مصحف دیکھیں
اے صبا چل کے الٹ دو رخِ سرِ سہرا

چن کے گل سینکڑوں لایا ہے ارم سے گلچیں
تو بھی مشکل سے بنا ہے ترا گز بھر سہرا

غالب کی زمین میں ایک اور غزل ملاحظہ کیجئے ؎

اس کی شانِ گونا گوں ہم پر نمایاں ہو گئیں
کیسی کیسی صورتیں پیدا و پنہاں ہو گئیں

اسکے پرتو سے ہے ان میں جلوہ ہائے رنگا رنگ
میری آنکھیں روکشِ رخسارِ جاناں ہو گئیں

دن کو مخفی تھی بنات النعش کی بازی گری
رات کے پردے میں کھل کھیلیں کہ عریاں ہو گئیں

پیرو غالب کا تاباں تو ہی ہے زلہ ربا
تجھ سے ذرّے پر شعاعیں ان کی تاباں ہو گئیں

ٹیو جے پوری

تقی الدین نام اور ٹیو تخلص تھا۔ ٹیو کے آبا و اجداد تو نارنول ریاست پٹیالہ کے رہنے والے تھے مگر ٹیو کی پیدائش ۱۸۸۱ء میں ریاست جے پور میں ہوئی۔ جے پور ہی میں پلا بڑھا اور ستاون سال کی عمر میں جے پور کی ہی زمین میں پیوند ہو گیا۔ اگرچہ ٹیو کی علمی استعداد بہت معمولی تھی تاہم نہایت زود گو اور پرگو شاعر مانا جاتا تھا۔ ٹیو کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ہوا ہوں عشق میں اس کے خراب آہستہ آہستہ
ملا ہے مجھ کو ٹیو کا خطاب آہستہ آہستہ
دبایا ہاتھ الفت میں تو جھنجھلا کر کہا اس نے
یہ کیا کرتا ہے او خانہ خراب آہستہ آہستہ

رباعی

جب سے آیا ہوں دارِ ہستی میں
عمر کاٹی خدا پرستی میں
اس بڑھاپے میں کیا کہوں ٹیو
اب گزرتی ہے فاقہ مستی میں

غزل

اس طور سے رقیب ہیں دلبر کے آس پاس
رہتے ہیں جیسے خارِ گلِ تر کے آس پاس
مرنے کے بعد تیری چوکھٹ رہے قریب
یوں گھر بنا لیا ہے تیرے گھر کے آس پاس

دیوان "کشتِ زعفران" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا جو اب ناپید ہے۔

ثباتؔ مظفر نگری

مہر علی نام اور ثباتؔ تخلص تھا۔ یہ بڑھانہ ضلع مظفر نگر کا رہنے والا تھا۔ عاشق مزاج اور حسن پرست شخص تھا۔ تمام وقت یار باشی اور دلفریب صحبتوں میں بسر کیا کرتا تھا۔ نتیجتہً علم سے کورا رہ گیا۔ بڑے بوڑھوں نے بہت سمجھایا مگر بے سود رہا، بالآخر اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا۔ جلد ہی قطرت کا انتقام شروع ہو گیا اور دنیا اس پر تنگ ہو گئی تو مجبوراً گھر چھوڑ کر دہلی میں آباد ہو گئے۔ حسینوں کی صحبتوں اور عاشق مزاجی نے جذبات کو برانگیختہ کرکے شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ فطری موزونیت، جودتِ فکر اور ظرافت ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ جو کچھ کہا اپنی بے بضاعتی کے باوجود خوب کہا ہے۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

کہتے ہیں تیرے خواب میں آنا نہ چاہیئے — سوتا ہوا نصیب جگانا نہ چاہیئے
شب کو جو میں نے زلف کو چھیڑا تو یوں کہا — مار سیاہ کو ہاتھ لگانا نہ چاہیئے
دیکھا مجھے تو ہو کے خفا غیر سے کہا — اس بزم میں ہر ایک کو آنا نہ چاہیئے
کھل جائے گا وہاں کسی دن کسی پہ رازِ عشق — اے دل اس اضطراب سے جانا نہ چاہیئے
اگلی لگاوٹیں بھی ذرا یاد کیجئے — دل لے کے میرا آنکھ چرانا نہ چاہیئے

کٹتی ہے واں ثباتؔ زباں بات بات پر
محفل میں ان کی ہونٹ ہلانا نہ چاہیئے

maablib.org

ثابت ملتانی

ثابت علی شاہ ابن مدار علی شاہ المتخلص بہ ثابت ۱۱۵۳ھ مطابق ۱۷۴۰ء میں ملتان میں پیدا ہوئے ابتدا میں قرآن شریف پڑھنے کے بعد فارسی اور سندھی کی تعلیم حاصل کی اور سیوہن کے سجادہ نشین سیّد عبداللہ شاہ کے مرید ہو گئے اور ان کی مجلسوں میں روضۃ الشہداء اور انیس و دبیر کے مرثیے پڑھنے لگے۔ یہ سندھ میں مرثیہ گوئی کی بنا ڈالنے والے تھے۔ فارسی اور سندھی سے واقفیت کے بعد انہیں اردو اشعار پڑھنے کا شغف پیدا ہوا اور یہ مشہور بڑے شعراء کی نظموں نعتوں اور مرثیوں کے تتبع میں اشعار کہنے لگے۔ شاعری میں پہلے مخدوم نور الحق اور بعد میں ٹھٹھہ کے میاں غلام علی مدّاح سے اصلاح لینے لگے۔ ثابت نے بہتّر سال کی عمر میں ۲۷ رجمادی الثانی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں سیوہن میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے موصوف کے فارسی دیوان کے قلمی نسخہ میں ان کا کچھ اردو کلام بھی محفوظ ہو گیا ہے اس سے منقبت کے اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

اے حق کے ولی ابن علی میری مدد کر
ہر وقت خفی اور جلی میری مدد کر
تجھ بابا کے حق میں نادِ علی میری مدد کر
(۱) سائل ہوں کھڑا تیری گلی میری مدد کر
ابنِ علی، اللہ کے ولی میری مدد کر
یا حضرت عباس علی میری مدد کر

ثابت علی اے شاہ تیرے در کا گدا ہے
زوار تیرا تجھ پہ دل و جاں سے فدا ہے
حسنین کا صدقہ میری ہر دم یہ صدا ہے
(۲) کر مہر سیں مقبول جو مجھ دل کی دعا ہے
ابنِ علی، اللہ کے ولی میری مدد کر
یا حضرت عباس علی میری مدد کر

ثابت علی، الحمد دعا ہے تیری مقبول
اس در سے سبھی تیری مرادیں ہوں محصول
یہ در ہے خدا بخدا اور کہیں مت بھول
(۳) ہر وقت رہا کر تو اسی ذکر میں مشغول
ابنِ علی، اللہ کے ولی میری مدد کر
یا حضرت عبّاس علی میری مدد کر

جرأت دہلوی

اصل نام یحییٰ امان ولد حافظ امان دہلوی تھا۔ مگر یہ شیخ قلندر بخش جرأت کے نام سے موسوم تھے۔ ان کے خاندان کا سلسلہ رائے امان محمد شاہی سے ملتا ہے، دربار شاہی میں ان کے بزرگ دربانی کی خدمت پر معمور تھے۔ امان کا لفظ زمانہ اکبری سے ان کے خاندانوں کے ناموں کا خلعت چلا آرہا تھا۔

جرأت اگرچہ علم تحصیلی میں ناتمام تھے لیکن قدرت نے طبع موزوں بخشی تھی۔ انہیں میاں جعفر علی حسرت کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ مشق اور سخت محنت سے جرأت نے اپنے کلام میں ایسی پختگی پیدا کی کہ استاد سے زیادہ شہرت پائی اور صاحب طرز شاعر کے طور پر مشہور ہوگئے۔

جرأت شاعری کے علاوہ علم نجوم کے بھی ماہر تھے اور فنِ موسیقی سے بھی شغف رکھتے تھے چنانچہ ستار بہت عمدہ بجاتے تھے۔ اوّل نواب محبت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں لکھنؤ میں وارد ہوئے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔

اگرچہ جرأت عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہوگئے تھے لیکن انہوں نے مشق سخن جاری رکھی۔ ان کی طبیعت غزل کے لئے عین مناسب تھی۔ جو باتیں ان کے دل میں آتیں وہ صاف صاف کہہ دیتے اور انہیں اس طرح بیان کرتے کہ لوگ سن کر پھڑک اٹھتے تھے۔ انہوں نے میر اور سودا کی غزلوں پر اکثر غزلیں کہی ہیں جن سے ان کے کمال فن کا پتہ چلتا ہے۔

جرأت آخر عمر تک لکھنؤ میں قیام پذیر رہے اور وہیں ۱۲۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں فوت ہوگئے۔ شیخ ناسخ نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

جب میاں جرأت کا باغ دہر سے + گلشن فردوس کو جانا ہوا
مصرعہ تاریخ ناسخ نے کہا + ہائے ہندوستان کا شاعر موا

۱۲۲۵ھ
۱۸۱۰ء

جرأت کا دیوان نایاب ہے پھر بھی تلاش بسیار سے مل جاتا ہے۔ اس میں غزلیں، رباعیات، مخمس، واسوخت، ہجویں وغیرہ ہیں۔ اس کے کلام کے چند نمونے پیش کئے جا رہے ہیں۔

انتخاب اشعار

خط کس کا یہ آیا ہے کہ جرأت جسے تو نے — اک دم میں اٹھا آنکھوں سے سو بار لگایا

کیا لڑکپن کا ہے عالم اس بت نادان کا — بھولی بھولی صورت اور اس پر وہ بالا کان کا

ہوا جب بات کرنا ترک بالکل — تو کیا اس بات کا چرچا نہ ہوگا

مبتلا ہوں میں کسی اک بت ہرجائی کا — جا بجا کیوں نہ ہو شہرہ مری رسوائی کا

بلائیں ہاتھوں نے جو لیں تمہاری رات — بلائیں ہاتھوں کی لیتا رہا میں ساری رات

اس کا کیا حال کہوں اب تو یہ حالت ہے کہ آہ — کچھ بھی سمجھی نہیں جاتی ترے بیمار کی بات

نہ جی کو دل کی خبر ہے نہ دل کو جی کی خبر — ترے بغیر کسی کو نہیں کسی کی خبر

میری وحشت سے دل ہی دل میں رک کر یوں وہ کہنے لگا — الٰہی لگ گئے کیوں ایسے دیوانے کو پیارے ہم

دم مارتے نہیں اور اٹھاتے ہیں ظلم یار — اپنا جو اک مزاج پڑا ہے نباہ کا

کون دیکھے گا بھلا اس میں ہے رسوائی کیا — خواب میں آنے کی بھی تم نے قسم کھائی کیا

تھا یہی دھڑکا خدا جانے کہ کیا لائے پیام — جا کے واں سے جو نہ آیا نامہ بر اچھا ہوا

اپنے پہلو سے وہ جب اٹھ کے چلا اے جرأت — اس کا منہ دیکھ کے بس رہ گئے مجبور سے ہم

میری بیتابی سے محفل میں یہ دھڑکا ہے اسے — اٹھ کے ہونے نہ لگے یہ مرے قربان کہیں

قطعات

(۱)
سینو شوخی کہ یہ کہتا ہے وہ قاصد سے مرے
نامہ لے پہنچا ابھی واں جانے میں تاخیر لگا
جرأت اپنو جو درکار اگر بعدِ فنا
دیکھو اس کی مرے تابوت پہ تصویر لگا

(۲)
کل واقف کار اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم
کیا جانیے کم بخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی، مان گئے ہم

(۳)
کوچہ جاناں سے جاتے ہیں پہ جا سکتے نہیں
گو اٹھاتے ہیں قدم، پر دل اٹھا سکتے نہیں
جی میں سو بار آئے جرأت نہ ملیئے یار سے
پر سمجھ کر دل میں کچھ سوگند کھا سکتے ہیں

جرأت کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

بال سلجھانا ترا کنگھی سے دل الجھائے ہے
اور بکھرا دیکھ کر بس جی ہی بکھرا جائے ہے

کیا صفائی سے ترے ماتھے کی نسبت چاند کو
وہ بھی دل پر داغ اس کے عشق کا دکھلائے ہے

وہ کمانیں ہیں بھویں تیری کہ جس کو دیکھ کر
اک جگر پر گھاؤ سا بن تیرے ہی لگ جائے ہے

انکھڑیاں جادو بھری پلکیں برچھیاں بھالا نگاہ
بانکی چتون ہائے تیری دلکو کیا کیا بھائے ہے

سرخ چوٹی دیکھ ڈوری جال میں پھنستا ہے دل
نکلے ہیں کیا کیا ادائیں جب کہ تو شرمائے ہے

جرأت کی ایک اور غزل ملاحظہ کیجئے اور قادر الکلامی کی داد دیجئے۔

اے دلا ہم ہوئے پابندِ غمِ یار کہ تو
اب اذیت میں بھلا ہم ہیں گرفتار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ عاشق ہو اب اتنا تو بتا
جا کے ہم روتے ہیں یا پیٹے ہے سر پسِ دیوار کہ تو

ہاتھ کیوں عشقِ بتاں سے نہ اٹھایا تو نے
کفِ افسوس اب ہم ملتے ہیں ہر بار کہ تو

وہی محفل ہے وہی لوگ وہی ہے چرچا
اب بھلا بیٹھے ہیں ہم شکلِ گنہگار کہ تو

ہم تو کہتے تھے کہ لب سے نہ لگا ساغرِ عشق
مئے اندوہ سے اب ہم ہوئے سرشار کہ تو

بے جگر جی کا پھنسانا تجھے کیا تھا درکار
طعن و تشنیع کے اب ہم ہیں سزاوار کہ تو

وحشتِ عشق بری ہوتی ہے دیکھا ناداں
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کہ تو

آتشِ عشق کو سینے میں عبث بھڑکایا
اب بھلا کھینچوں ہوں میں آہِ شرربار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ ہمراہ کسی کے لگ چل
اب بھلا ہم ہوئے رسوا سرِ بازار کہ تو

غور کیجئے تو یہ مشکل ہے زمین اے جرأت
دیکھیں ہم اس میں کہیں اور بھی اشعار کہ تو

جرّاح دہلوی

غلام ناصر پسر حافظ رمضان نام اور جرّاح تخلص تھا۔ باپ کی طرح حافظ قرآن تھا۔ دہلی میں فن جراحی کی وجہ سے شہرت تھی یہ کشمیری الاصل تھا مگر دہلی میں پیدائش کے باعث دہلوی کہلاتا تھا علمی استعداد سے قطعی بہرہ ور نہ تھا تاہم سخن سنجان دہلی کی صحبتوں اور موزونیت طبع کی وجہ سے شعر کہتا تھا۔ اکثر مطلع میں اپنے پیشہ کی جانب اشارہ ضرور کرتا تھا۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے اس کے ذہن رسا اور بلندیٔ فکر کی تعریف کی ہے۔ لیجئے آپ بھی اس کی کاوش طبع ملاحظہ کیجئے ؎

اک دم نہیں ہے اس بت خورشید رو کو چین
پھرتے ہیں جیسے سیارہ گرم سے ہے

جرّاح ٹانکے دینے میں مت کرو درنگ تو
اس واسطے کہ زخم مرے یار گرم ہے

جوشؔ دہلوی

نام رحیم الدین عرف رحمو اور جوشؔ تخلص تھا۔ خاک دہلی سے خمیر ہوا اور اسی کی مٹی میں پیوند ہو گیا۔ آزاد منش اور یار باش آدمی تھا اس لئے تحصیل علم سے قطعی بے نیاز رہا۔ شاعری سے البتہ لگاؤ تھا۔ موزونیت اور شوق کی وجہ سے شعر کہتا تھا۔ پہلے مرزا فدوی سے اصلاح لیتا تھا جب ان کا انتقال ہو گیا۔ تو مصحفیؔ کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گیا جو ان دنوں دہلی میں مقیم تھے، ۱۸۹۳ء تک دہلی میں صحیح سلامت دیکھا گیا۔ مقامی مشاعروں میں شرکت کر کے داد تحسین حاصل کرتا تھا۔ طبیعت میں آزادی اور لاپرواہی کی وجہ سے کلام محفوظ نہیں رکھ سکا۔ بہرحال نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش ہیں۔

ظرف پر اپنے نظر کر تو ابھی لڑکا ہے
منہ صراحی سے نہ آ و دلبر مے خوار لگا

میں نے جو کہا تجھ بن کیا کیا نہ الم گزرا
بولے کہ اے تیرا روتے ہی جنم گزرا

دریا مری آنکھوں سے تت جاری لہو کا ہے
بے درد تو کیا جانے کیا حال کسو کا ہے

جلیل کمال پشاوری

جلیل احمد کمال نام اور جلیل کمال تخلص ہے۔ یہ ۱۹۴۳ء میں علاقہ گنج پشاور شہر میں پیدا ہوئے اور بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ خالہ کیونکہ لاولد تھیں اس لئے پیدائش کے دو سال بعد خالہ نے جلیل کمال کو گود لے لیا اور بہت ناز و نعم سے پالا۔ بیجا لاڈ پیار کی وجہ سے جلیل ان پڑھ رہ گئے اور کوئی معقول ہنر بھی نہ سیکھا۔ بیس سال قبل پشاوری چپلی بنانے کا کام کرتے تھے۔ ۱۹۷۵ء میں شدید بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر نے محنت مشقت کا کام کرنے سے منع کر دیا ہے۔ اب چھوٹا موٹا کام کر لیتے ہیں باقی یاد اللہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جلیل کمال کے باپ عبداللطیف ساجن پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ شاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ ماحول کی وجہ سے جلیل کمال نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ جو کچھ موزوں کرتے اسے باپ کی اصلاح سے مزین کر لیتے ہیں۔ موصوف ریڈیو۔ ٹیلی ویژن اور اباسین آرٹ کونسل کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مشاعروں میں اکثر حصہ لیتے ہیں۔ خوب پڑھتے ہیں۔ کلام حاضر ہے۔

غزل

ہمیں اب زندگی بار گراں معلوم ہوتی ہے
ہر ایک ساعت تقاضائے ناگہاں معلوم ہوتی ہے

تڑپ دل میں شرر سینے میں لب پر مہر خاموشی
مجھے ہر سانس اب آتش فشاں معلوم ہوتی ہے

ہوا کچھ اس طرح سے مبتلا دل دردِ فرقت میں
دوائے دل محالِ فکر جاں معلوم ہوتی ہے

شہید جستجو حسرت چمن زار محبت میں
مثال بلبلِ بے خانماں معلوم ہوتی ہے

بساطِ حسرت و ارماں ملی خونِ تمنا میں
کمالؔ اب چشم پرنم خوں فشاں معلوم ہوتی ہے

جلیلؔ کمال کی ایک دوسری غزل پیش ہے۔

۱۔ آنکھیں اداس اداس پریشاں نظر لئے　　بیٹھے ہیں تیری یاد میں دردِ جگر لئے
ہم نے شبِ فراق ستاروں کے ساتھ ساتھ　　کاٹی تڑپ تڑپ کے جگر میں شرر لئے
اک پھول کی تمنا میں اے دوست ہم نے آج　　کانٹے ہزار دامنِ حسرت میں بھر لئے
آزاد مجھ کو کر دیا صیاد نے تو کیا　　اڑنے کے لئے پر جو میرے تھے کتر لئے

لطفِ کمالؔ یہ ہے کہ میرا جنونِ شوق
پہنچا ہے چمن میں مجھے بارِ دگر لئے

نغمہ

۲۔ دل کو تمہاری یاد سے بہلا رہے ہیں ہم　　کتنا حسین فریب ہے جو کھا رہے ہیں ہم
آجا کہ چاند سے کوئی پھوٹے نئی کرن　　خاموش چاندنی ہے اور اکتا رہے ہیں ہم
پلکوں پہ جل رہے ہیں تمناؤں کے چراغ　　دامنِ شبِ فراق کا چمکا رہے ہیں ہم
بے چین زندگی ہے اور مایوسیوں کا ساتھ　　جینے کی آرزو تھی سو مرے جا رہے ہیں ہم

منتخب اشعار

؎ اک موڑ تک جو چل نہ سکے تھے کبھی ندیم　　لیکن دیارِ حسن میں بے سانس دو دم گئے
؎ حالاتِ روزگار سے اکتا گیا ہے دل　　کچھ رنجشیں وابستہ ہیں جینے کا مزا گیا
؎ ہے طرزِ کجروی اگر اندازِ محبت　　پھر داستانِ شوق مٹا کیوں نہیں دیتے
؎ نازک بدن ہے غنچہ دہن نازنین ہے وہ　　سنگِ گراں ہیں ان کی مگر رہگزر میں ہم
؎ گزرا تیری تلاش میں اک عرصۂ حیات　　مجنوں کی طرح بن میں کبھی کوہسار میں

جگر مرادآبادی

علی سکندر جگر مرادآبادی کے بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہجہاں بادشاہ کے اُستاد تھے جو عتاب شاہی کے باعث دہلی چھوڑ کر مرادآباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ جگر کے والد مولوی محمد علی نظر صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ جگر کی پیدائش ۱۸۹۰ء میں مرادآباد میں ہوئی۔ تعلیم زیادہ نہ تھی۔ ابتداء میں فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ پھر ذاتی شوق اور کثرت مطالعہ سے علمی کمی کو پورا کر لیا اور موجودہ مقام تک پہنچے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ شروع میں اپنے کلام پر والد سے اصلاح لیتے تھے۔ بعدازاں داغ دہلوی اور منشی امیراللہ تسلیم سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ تین شعری مجموعے داغِ جگر، شعلۂ طور اور آتشِ گل یادگار ہیں۔ آتشِ گل ۱۹۵۲ء میں چھپا تھا جسے ہندوستان ساہتیہ اکیڈمی نے بہترین تصنیف قرار دے کر پانچ ہزار روپیہ کا انعام دیا تھا۔

جگر کی شاعری میں سرمستی و سرشاری کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ انہیں ہمعصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ کلام میں عموماً عام فہم اور سادہ زبان استعمال کی ہے اور حسن و عشق کے معاملات و کیفیات کو والہانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

جگر کا موضوعِ سخن اصغر اور فانی کی طرح فلسفہ و تصوف نہیں تھا۔ وہ داغ کی طرح خالص عاشقانہ شاعری کے شاعر تھے۔ انہوں نے اصغر سے احترام و عقیدت کا رشتہ ضرور استوار رکھا لیکن شاعری میں ان کی اتباع کی کوشش نہیں کی۔ جگر کی شاعری واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا دور رندی و سرمستی کا دور ہے لیکن اس میں بھی ایک خاص قسم کی پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ دوسرا دور جگر کے ذہنی و روحانی

انقلاب کے بعد شروع ہوتا ہے جو دراصل شاہ عبدالغنی منگلور شریفؒ سے بیعت کا نتیجہ تھا۔ اب جگرؔ کے کلام میں جذبات کے ساتھ گہری سوچ ٹھہراؤ اور بلندیٔ فکر نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص رنگ تغزل میں انسانی کمزوریوں، حقیقتوں اور حسن وعشق کے معاملات کے ساتھ سیاسی وسماجی تاثرات کو خوش اسلوبی سے اپنے کلام میں سمویا ہے۔ جگرؔ کی ہمہ گیر مقبولیت میں ان کی رندی وسرمستی کے ساتھ ان کے منفرد ترنم اور انداز غزل گوئی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ برِصغیر کے اُردو داں عوام وخواص نے جن میں ہر قوم و طبقے کے لوگ شامل تھے جگرؔ کو امام متغزلین کے خطاب سے ان کی زندگی میں ہی نوازا ہے۔ جگر صاحب ستّر سال تک اس چمنستان حیات میں نغمہ سرا رہے۔ بالآخر ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

امام متغزلین کی چند غزلیں ونظمیں پیش خدمت ہیں۔

غزل

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دِل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا

جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ رے معراجِ شوق
دیکھتا کیا ہوں وہ جانِ انتظار آ ہی گیا

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

اسطرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
درحقیقت جیسے مجھکو اعتبار آ ہی گیا

جان ہی دیدی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

ایک مشہور غزل کے چند اشعار پیش ہیں :-

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرّے ذرّے میں سما جاتا ہوں میں

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگرؔ
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

جگرؔ کی ایک نظم "آجکل" سے چند اشعار :-

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انسان کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل

کیسا خلوص، کیسی محبت، کہاں کا درد
خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آج کل

کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر
کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آج کل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگرؔ
وہ مصلحت جو پیشۂ مرداں ہے آج کل

جگرؔ کی ایک اور نظم "نوائے وقت" سے چند اشعار حاضر ہیں :-

اٹھو اٹھو کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے
بڑھو بڑھو کہ چار سو پکار ہی پکار ہے

وہ وقت ہے کہ علمِ حق ہے شیطنت میں گم
وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

کہاں کے مطرب و غزل کہاں کے شاہد و چمن
کہ زندگی تمام تر بساطِ کارزار ہے

زمیں کو روندتے ہوئے صفوں کو چیرتے ہوئے
بڑھے چلو بڑھے چلو یہ وقت کی پکار ہے

چمن دہلوی

گل محمد نام اور چمن تخلص تھا۔ یہ کشمیری الاصل تھا لیکن دہلی میں رفوگری کی دوکان تھی۔ بالکل حرف ناشناس تھا۔ کپڑوں پر زر دوزی کے کام کے ساتھ فکرِ سخن بھی کرتا جاتا تھا۔ جب کوئی شعر موزوں ہو جاتا تو کسی لکھے پڑھے آدمی سے اسے لکھوا لیا کرتا۔ کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں کیا تھا۔

نمونہ کلام یہ ہے۔ ۔ ؎

؎

ہمارے چاک جگر پر ہو کیا کسی کو خیال
پھٹے میں پاؤں کسی کے دیا نہیں جاتا

؎

ہوش جس مے نے زلیخا کے اڑائے خواب میں
ہم بھی اے ہمدم اسی کے دیکھنے والوں میں ہیں

؎

یوں بدن پر ہیں چمن کے داغ تیرے ہجر میں
پھول جیسے اے سمن بر ان تیرے شانوں میں ہیں

چلبل گجراتی

نام غلام عباس اور چلبل تخلص تھا۔ یہ جنوبی افریقہ کے شہر نیٹال میں پیدا ہوا۔ سورت (انڈیا) کے شہر گجرات کا رہنے والا تھا۔ مادری زبان گجراتی تھی۔ معمولی لکھا پڑھا شخص تھا۔ منشی واصف گجراتی سے دوستی اور ہمہ وقت صحبت کی وجہ سے اسے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ انہی کو اپنا کلام اصلاح کے لئے دکھاتا تھا۔

نمونہ کلام یہ ہے۔۔

غزل

چل اے قلم ادب سے یہاں دم بخود نہیں
وصف رسول لکھتا ہوں وصف صنم نہیں

دم ہو تو خود بخود تو ہی کاغذ پہ چل قلم
وصفِ رسول لکھوں یہ مجھ میں تو دم نہیں

واعظ خدا کے واسطے طیبہ کا ذکر چھیڑ
جنت کے ذکر میں تو ترے کوئی دم نہیں

طیبہ کے گل تو گل ہیں مگر خار خار بھی
جنت کے پھول سے کوئی خوشبو میں کم نہیں

محشر میں مل گیا ہے سہارا رسول کا
اب ہم کو پل صراط کا کچھ رنج و غم نہیں

چلبل کی ایک اور غزل حاضر ہے۔

ایک دو کیا، لاکھوں انسان کے گلے
کٹ گئے ہیں زن، زمین، زر کے لئے

کیا ہماری اتنی ارزاں جان ہے
نذر کر دیں ایک جنبش کے لئے

کیا کسی کی کر سکیں امداد ہم
پاس کوڑی تک نہیں تن کے لئے

اتنی الفت تو خدا کی بھی نہیں
جتنی الفت ہے ہمیں دلہن کے لئے

گھر کا سب سامان چلبل بک چکا
صرف اک چادر ہے چلمن کے لئے

چلبل کی دوسری غزل پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ کیجئے اور زبان پر عبور کی داد دیجئے!

جانے کیا کرنے کو ہے کمبخت یہ دل آج کل
ان حسینوں پر بے طرح ہوتا ہے مائل آج کل

کیا ہوا جو آج کل ہیں ہم حسینوں پر فدا
تو بھی تو اے شیخ خود ہے زر پہ مائل آج کل

موت کی مشکل بھی اتنی تو نہ ہوگی سخت تر
ہجر کے صدمے کی ہم پہ ہے جو مشکل آج کل

قیس تو دیوانہ تھا تو تھا وہ مائل ایک پر
ہم تو دلدہ ہیں تو ہم ہیں دس پہ مائل آج کل

جس کے دسترخوان پہ کھاتے تھے چلبل سیکڑوں
وہ کہاں پہلے سے اب ہیں صاحب دل آج کل

فلک پر لاکھ چمکے تو ہوا کیا
کبھی تارا مہ کامل بنا کیا

ہمیشہ کان میں جھمک کے تیرے
نہ جانے کہتی ہے زلف رسا کیا

نہ وعدے پہ تیرے آنے سے ظالم
گماں گزرے ہمارے دل میں کیا کیا

متفرق اشعار

— خموشی ہی سہی چلبل بتوں میں
تو کچھ وہ ہوگئے اس سے خدا کیا

— تیرے بندوں کے گناہوں کی تو ہوگی تعداد
پر کرم کی تیرے یارب کوئی تعداد نہیں

— اتنا تو یاد ہے اس رخ سے اٹھا تھا پردہ
بعد پھر اس کے ہوا کیا وہ مجھے یاد نہیں

— تیری تصویر بھی غصّہ میں تجھ سے کم نہیں ظالم
جو تکتا ہے اسی کو گھورتی معلوم ہوتی ہے

— جہاں پر ختم ہونے کو تھا مجنوں کا افسانہ
وہیں سے ہم نے اے چلبل کہانی جوڑ دی اپنی

چھتر بھوپالی

چھتر سال نام اور چھتر ہی تخلص تھا، بھوپال کی تحصیل بیرسیہ میں چھوٹے پیمانہ پر کاشتکاری کرتا تھا، بالکل ان پڑھ تھا لیکن بلا کا موزوں طبع واقع ہوا تھا۔ زیادہ تر مزاحیہ اور طنزیہ کلام کہتا تھا۔ زود گو اور پُر گو تھا بیٹھے بیٹھے بیس (۲۰) پچیس (۲۵) اشعار کہہ دینا اس کے لئے معمولی بات تھی اس صفت کی وجہ سے بیرسیہ کے رئیسوں اور افسران قصبہ کی محفلوں کی رونق بنا رہتا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں جب بھوپال میں زمینداری ختم کر کے رعیت واڑی سسٹم جاری ہوا تو اس اصلاحی اسکیم کی سخت مخالفت کی گئی۔ اسی زمانہ میں اتفاق سے آسمانی آفتوں نے بھی سارے بھوپال میں فصلوں کو برباد کر دیا۔ جاہل دہقانوں نے فصلوں کی خرابی کو اس اصلاحی اسکیم کے سر تھوپ دیا۔ چھتر سال چھتر نے اس واقعہ کو اپنی نظم "رعیت واڑی" میں مخصوص انداز سے پیش کیا ہے۔

بطور نمونہ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

سنہ گزشتہ میں پڑا گیروا اب کے پالا ‏ ‏ ‏ دونوں قحطوں نے زراعت کو مٹا ہی ڈالا
تھا حکم جانچ کا پر کچھ نہیں دیکھا بھالا ‏ ‏ ‏ دو دو چار لے لیے تخمینوں میں جھگڑا ڈالا
وار پروار پڑے لوگوں کے سر پر بھاری ‏ ‏ ‏ آگے کس طرح سے چل سکتی ہے رعیت واڑی

نواب حمید اللہ خاں کے عہد حکومت کو "دور سلطانی" کی ترقیات و اصلاحات کا تتمہ، کہا جاتا ہے۔ نواب صاحب موصوف تمام ہندوستانی والیان ریاست میں پہلے گریجوٹ تھے، روشن خیال اور جدید نظام کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ عنان حکومت سنبھالتے ہی انہوں نے ریاست بھوپال میں تیزی سے اصلاحات شروع کر دیں بیرون ریاست سے تجربہ کار اور قابل افراد کو بڑی بڑی تنخواہوں پہ لا لا کر ریاست کے اعلیٰ

عہدوں پر مامور کر دیا۔ نواب صاحب کے اس عمل سے ریاست کے قدیم باشندے بالخصوص ملازم پیشہ طبقہ مالی ابتری سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس حالت کا نقشہ چھتر سال چھتر نے درج ذیل مسدس میں پیش کیا ہے جس کے دو بند پیش کئے جاتے ہیں۔

ہمیشہ وطن کا رہے ان کو پاس — وطن سے بلائیں وہ سالے اور ساس
وہاں جو سدا کاٹا کرتے تھے گھاس — یہاں ان کی تنخواہیں ستر اور پچاس

وطن کے دروغہ و تحصیلدار
کہو کس جگہ کریں ہم روزگار

وزیر ایک آیا نئی چال کا — کیا جس نے انتظام بھوپال کا
خزانہ جمع تھا کئی سال کا — نہ اس کا پتہ ہے نہ اس سال کا

گریباں غریبوں کا ہے تار تار
کہو کس جگہ کریں ہم روزگار

چھتر کی ایک اور مزاحیہ غزل سے لطف اٹھائیے۔

لے گئی دل کو میرے ان کی نظر ۲/۳ — کھا گئی ان کی ادا میرا جگر ۲/۳
پانچ فٹ قد ہے تو ۳۲ ہے سینہ انکا — اس پہ خوبی ہے کہ ظالم کی کمر ۲/۳
بزم اغیار میں جا جا کے وہ جاناں بیٹھا — دیکھ لو ہو گیا صحبت کا اثر ۲/۳
ترچھی نظروں سے ادھر دیکھتے جاتے ہیں وہ — پہنچ جائے نہ کہیں آدھ فر ۲/۳
ایک ناڈی پہ گذر کس طرح ہووے صاحب — ایک میں ایک ہے زن، ایک پسر ۲/۳

یہ عجب طرح کی لکھی ہے غزل تو نے چھتر
ضرب تقسیم کی ہے اس میں کسر ۲/۳

حاتم دہلوی

شیخ ظہور الدین خلف شیخ فتح الدین نام اور حاتم تخلص تھا۔عام طور پر شاہ حاتم کے نام سے مشہور تھے۔یہ ۱۶۹۹ء میں دلی میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹۲ء میں اسی شہر کی مٹی میں پیوند ہو گئے۔حاتم کو اردو زبان کا باوا اور تمام شعراء کا جد امجد خیال کیا جاتا ہے۔اگرچہ امی محض تھے مگر مبداء فیاض نے بلا کی ذہانت اور فطری موزونیت عطا کی تھی۔تمام کہنہ مشق قدیم شعراء میں انہیں نمایاں مقام حاصل تھا آپ سے استفادہ کرنے والے شاگردوں میں اپنے وقت کے بڑے بڑے شعراء نے آپ کی ذات والا صفات سے کسب فیض کیا ہے۔حاتم کو سودا، تاباں اور رنگیں وغیرہ جیسے عظیم المرتبت شعراء کا استاد ہونے کا فخر حاصل ہے۔آپ نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔صاحب دیوان تھے جو دلی کے علاوہ بیرونجات میں شہرت کا باعث بنا اور دربار شاہی تک رسائی ہوئی۔

حاتم کی ابتدائی زندگی بے راہ روی کا شکار تھی لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد انہوں نے فسق و فجور سے توبہ کر کے درویشی اختیار کر لی تھی اس طرح حاتم شاہ حاتم اور صوفی و درویش ہو گئے تھے۔حاتم نے اس طرح ساری زندگی قلندرانہ طور پر بسر کر دی۔

اردو شاعری میں ۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء کے عرصہ میں بڑی تبدیلیاں آئیں پہلی شعری تحریک یا رجحان ایہام گوئی کی طرف تھا۔دوسری بڑی تبدیلی سادہ گوئی یا جذبات نگاری کی تھی۔شاہ حاتم کا کلام ان رجحانات کا آئینہ دار ہے۔حاتم نے ان نئے رجحانات کو لبیک کہا اور زبان و بیان میں تبدیلیاں کیں جو ان کے اعلیٰ تنقیدی شعور کی دلیل ہے۔نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

؎ جو ہیں اہلِ سخن حاتمؔ انہیں مرنے سے کیا وحشت
مسیحا کی طرح جیویں قیامت تک سخن ان کے

؎ دل کی مری حقیقت کیا پوچھتے ہو یارو
یا حسرت بتاں ہے یا یاد رفتگاں ہے

؎ درد میرا کسو کے کہنے سے
تیرے ہو دلنشیں خدا نہ کرے

؎ حیرت ہے مجھے بہلا کر اُس بن
کس طرح سے اب تلک جیا ہوں

؎ کرتا نہیں میں خوشامدِ خلق
حاتمؔ ہوں ازل سے بے ریا ہوں

؎ ہجرت میں زندگی سے موت بھلی
کہ کہیں سب اسے وصال ہوا

؎ برس میں وہ کبھیں برسے ہے یہ برسوں سے برسے ہے
مقابل مت کرو باراں سے میری چشمِ گریاں کو

ے تو رنگِ گل کے اُوپر پھول مت کر اے بلبل
پلک کے مارتے فصلِ بہار گذرے ہے

شہر آشوب سے چند اشعار حاضر ہیں ے

ے ابر میں یادِ یار آوے ہے — گریہ بے اختیار آوے ہے
اے صبا کس طرف کو گذری تھی — تجھ سے بُوئے نگار آوے ہے
ٹک ادھر بھی گذر کر اس بُو سے — میرے دِل کو قرار آوے ہے
کِس زباں سے کروں تیرا شکوہ — جی میں کہتے حجاب آوے ہے
جس نے ویراں کیا ہے کعبۂ دِل — پھر وہ خانہ خراب آوے ہے
نوجوانوں کو دیکھ کر حاتم — یادِ عہدِ شباب آوے ہے

ے دِل ہے وابستہ تیرے دامن سے
دست میرا دسا نہیں تو نہ ہو
ہم تو تیری جفا کے بندے ہیں
تجھ میں رسمِ وفا نہیں تو نہ ہو

ہوشیار میرٹھی

عبدالحمید نام اور ہوشیار میرٹھی تخلص تھا۔ میرٹھ میں گجری بازار کے قریب چوک کرم علی میں ان کا ٹھیہ تھا۔ جہاں ہر وقت شاگردوں کا اژدھام رہتا تھا۔ ہوشیار برتنوں پر قلعی کرتے جاتے اور شاگردوں سے ان کا کلام سن کر اصلاح بھی کرتے جاتے تھے۔ اگرچہ امی تھے۔ تاہم اپنے زمانہ کے بہت عمدہ کہنے والوں میں ان کا شمار ہوتا تھا افسوس ہے۔ بے پروائی اور جہل کی وجہ کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ زمانہ قدیم کے جن بزرگوں نے انہیں دیکھا اور ان کا کلام سُنا ہے۔ ان سے یہ اشعار حاصل کر کے ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں ؎

میں پا سا تو بن نہ سکا چند شیخ سے
لیکن کسی گناہ میں لذت نہیں رہی

ایک غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ۔

اہلِ دِل بھی ہے کوئی بالیں پہ فرزانہ بھی ہے
میری خاموشی ، خاموشی بھی ہے افسانہ بھی ہے
درد سے تڑپوں تو کیوں بھرائے نالے کی صدا
اب میں سمجھا کوئی گوشہ دِل کا ویرانہ بھی ہے
محوِ حیرت کر نہ اتنا مجھ کو اے شانِ حرم
یہ نہ کہہ بیٹھے کوئی کافر کہ بت خانہ بھی ہے

فروری ۱۹۵۷ء میں دہلی میں یوم محمود دہلوی کے موقع پر ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ مشاعرہ کی طرح تھی "یہ تعجب ہے ذرا سی دوستی دیکھی نہیں جاتی" اس موقع پر ہوشیار نے جو غزل پڑھی تھی وہ ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے ؎

غزل

ہزاروں غم اُٹھا کر اک خوشی دیکھی نہیں جاتی
بہر صورت یہ دنیا دیکھ لی، دیکھی نہیں جاتی

اُمیدوں کے سہارے ہجر میں جینے کو جیتے ہیں
مگر ایسی نظر سے زندگی دیکھی نہیں جاتی

نظر کی ایک حد اور لامحدود ہیں جلوے
جہاں تک ہے وہاں تک روشنی دیکھی نہیں جاتی

مجھے جس حال میں بھی آپ رکھیں آپکی مرضی
مگر اس پر زمانہ کی ہنسی دیکھی نہیں جاتی

شعورِ عشق رفتہ رفتہ اسی منزل پہ آ پہنچا
غرورِ حسن سے بھی عاجزی دیکھی نہیں جاتی

نہیں روشن کوئی نقش و نگارِ حسنِ فطرت پر
ارے توبہ تمہاری سادگی دیکھی نہیں جاتی

کبھی ہوشیار کی فریاد تک بھی، جو نہ سنتے تھے
یہ عالم ہے اب ان سے خاموشی دیکھی نہیں جاتی

حسامی دہلوی

مرزا حسام الدین حیدر نام اور حسامی تخلص تھا۔ دہلی کی مردم خیز مٹی سے خمیر ہوئے اور استاد حیدر کے نام سے موسوم تھے ان کے والد مرزا خان اور خاندان کے دیگر بزرگ ایک زمانہ میں صاحب اقتدار اور متمول تھے مگر انقلاب زمانہ کے ہاتھوں حسامی خستہ حالی کا شکار ہوگئے، بچپن شدید مالی مشکلات اور پریشانیوں میں گزرا۔ تمام عمر روزی کمانے کی فکر دامنگیر رہی۔ چلا کاری اور داستان گوئی کو قوتِ لایموت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اس وجہ سے تعلیم کی تکمیل نہ کرسکے موزونی طبع کے باعث البتہ درسگاہ سخن میں ضرور داخل ہوگئے۔ فطری موزونیت اور فکر رسا سے شعر موزوں کرتے تھے۔ اس فن میں انہیں خدا بخش خان تنویر کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ فن موسیقی سے بھی شغف تھا۔ گلا اچھا پایا تھا۔ زبان کی سادگی اور مترنم آواز کے باعث ان کی غزلیں بہت جلد زبان زد خاص و عام ہو جاتیں۔ اور سامعین کلام بلاغت نظام سے خوب محظوظ ہوتے۔ لیجیے ان کا کلام ملاحظہ فرمائیے:

غزل

یارب ہمارے کام تو سارے سنوار دے
تیرے سوا ہے کون جو دل کو قرار دے

ظالم نے ایسے تخت کو برباد کر دیا
یاں موسم خزاں ہے، تو جلدی بہار دے

لوٹی گئی ہے اس طرح مخلوق ہند کی
دھمکا کے تیغ سے کہا، سب تار تار دے

غزل

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو اپنے قرار ہے

کروں غم ستم کا میں کیا بیاں — میرا غم سے سینہ فگار ہے
ملے شہر دہلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح یہاں امن — وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے
یہ رعایہ ہند تباہ ہوئی کہوں کیا کیا یہ جفا ہوئی — جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے
شب و روز پھولوں میں جو تُلیں وہ وہیں خار غم سے نگار ہیں — پڑے طوق قید میں جا بجا نہیں کہیں بدلے کا لگ کے یہ بار ہے
جو سلوک اوروں سے کرتے تھے وہی اب ہیں کرتے ذلیل و خوار — وہ زمیں تنگ چھٹے کے چور سے ہاتھی پہ ان کے سوار ہے
یہ زمانہ ہے برا الگ چلو بچ کے سب سے الگ — نہ رفیق کوئی کسی کا یاں نہ کسی کا کوئی بھلا یار ہے
کیا سحابی ڈر تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے برملا — تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامی و یار ہے

استاد حیدر کی ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

؎ کیا تم سے کہوں لطف ہے جو عشق صنم میں
پر اتنی برائی ہے کہ آرام نہیں ہے
مر جاؤں گا گھٹ گھٹ کے نہیں ہجر میں تیرے
رسوائے جہاں کرنا مرا کام نہیں ہے
کر ذبح مجھے شوق سے اے کافر بدکیش
تڑپوں تہہ خنجر یہ مرا کام نہیں ہے
اک لحظہ چین دل کو نہ اک دم قرار ہے
کیا جانے تیغ کس کی لگی کس کا وار ہے

حیدر صاحب اپنے دور میں صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی نگرانی و سرپرستی میں دِلّی سے کہکشاں، الہام، فرمان، سادات، تیغ، چنگاری اور دیگر رسائل کا اجرا ہوا۔ ان کے ہمعصران میں زمانہ قدیم کے مشہور دانشور و صحافی دیوان سنگھ مفتوںؔ، ملّا واحدی بلال احمد زبیری، عثمان آزادؔ، سردار علی صابری، عزیز حسن بقائیؔ، حافظ یوسف اور مفتی شوکت وغیرہ شامل تھے۔

موصوف کے تلامذہ کا سلسلہ بڑا وسیع تھا۔ ان میں سے بیشتر خود مرتبہ استادی پر پہنچ گئے، چند کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

نازشؔ دہلوی، حبیب اشعرؔ، فیضؔ جھنجھانوی، کرّارؔ نوری، رشیدؔ گجراتی، کنہیالال ازدہؔ، سیتا پرکاش مہتابؔ، نواب تاباںؔ، نواب حامدؔ، افضلؔ پشاوری اور قمرؔ سنبھلی وغیرہ۔

حیدر دہلوی دِلّی کی آخری بہار تھے، یہ ۱۷/جنوری ۱۹۰۶ء میں گلی شاہ تارا، اجمیری گیٹ دِلّی میں پیدا ہوئے اور ۱۰/نومبر ۱۹۵۹ء کو ۵۳ سال کی عمر میں گلے کے سرطان میں مبتلا ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ اور اپنے چاہنے والوں کو غم ان کے سپرد کر گئے۔

ع کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

حجام دہلوی

شیخ عنایت اللہ نام حجامؔ تخلص تھا۔ یہ ۱۷۵۸ء میں سہارنپور میں پیدا ہوا۔ مگر تمام عمر دہلی میں بسر کردی۔ دہلی میں شیخ کلو کے نام سے مشہور تھا۔ ذات کا حجام تھا مگر منکسر المزاج، دیندار اور ذہین شخص تھا۔ ممتاز عالم دین مولانا فخرالدینؒ سے بیعت تھا۔ ہفتہ میں دو روز منگل اور جمعہ کو اپنے پیرومرشد کی ڈاڑھی میں خضاب لگاتا تھا۔ اکثر و بیشتر ان کی مجلسوں میں حاضر رہتا اور ان کی خدمت کو اپنے لئے باعثِ سعادت و افتخار سمجھتا تھا۔

ایک مرتبہ مولانا موصوف نے حجامؔ کی خدمت سے خوش ہو کر اسے ایک دستار اور تہمد عنایت فرما دیا تھا۔ یہ اکثر اپنے پیرومرشد کا بخشا ہوا دستار و تہمد پہنتا تھا۔ محلہ والے اس کی بہت عزت کرتے اور شاہ صاحب کے معزز لقب سے اسے مخاطب کرتے جس سے حجامؔ کو بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی۔

غدر سے پہلے اور اس کے بعد ایک عرصہ تک شعر گوئی کو طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ ہر کس و ناکس یہاں تک کہ ادنیٰ پیشہ سے تعلق رکھنے والے لوگ لیلائے سخن پر بری طرح نثار تھے۔

حجامؔ اگرچہ قطعی حرف ناشناس تھا مگر شوق اور موزونیت کی مدد سے شعر کہتا تھا۔ مقطع میں اپنے پیشہ کا فخریہ اس طرح ذکر کرتا کہ سامعین اس کو پسند کرتے اور خوب داد دیتے۔ امی محض ہونے کے باوجود ملک الشعراء مرزا رفیع سوداؔ سے شرف تلمذ حاصل کیا ہوا تھا۔ استاد کی توجہ، فطری ذہانت اور مشق نے کلام میں پختگی پیدا کر دی تھی۔ سوداؔ کے ہمراہ مشاعروں میں شرکت کرتا اور حاضرین سے داد تحسین وصول کرتا تھا۔ لیجئے کاوش طبع ملاحظہ فرمائیے۔

غزل

ہے جی میں کہ اک روز میں ان آنکھوں سے پوچھوں
بچتے نہیں کس واسطے بیمار تمہارے

اس کاوش مژگاں کا گلہ مجھ سے عبث ہے
یہ آنکھوں پہ بوٹے ہوئے ہیں خار تمہارے

اس شوق کے کوچہ میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں گے اک روز یہ اوزار تمہارے

مختلف اشعار

روز رخسار کے لیتا ہوں مزے خوبوں کے
بہتر اس شغل سے حجام ہنر کیا ہوگا

کل میاں حجام سب کا مونڈتے پھرتے تھے سر
آج اس کوچہ میں ان کی بھی حجامت ہوگئی

خط آئینے بھی اپنی رسائی نہیں ہے واں
حجام کس طرح سے ملیں، کیا ہنر کریں

رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑے پانی
بلا حجام کو جس روز تم حمام کرتے ہو

کیوں مجھ کو ستاتی ہے اے گردش گردوں
میں نائی کا بیٹا ہوں کہیں سر نہ رگڑ دوں

اس شوق کے کوچہ میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں گے اک روز یہ اوزار تمہارے

ہُدہُد بہاری

چوہدری عبدالحفیظ خلف چودھری مولوی عبداللطیف ابن مولوی ریاضت حسین نام ، ہُدہُد تخلص تھا۔

یہ دسمبر ۱۸۹۵ء میں بمقام برہ پترہ (آرہ) صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ بہت کم پڑھے لکھے آدمی تھے مگر ارباب ادب کی نشستوں کی باضابطہ شرکت نے آپ کے جذبۂ سخن کو جاگر کر دیا تھا۔ مولوی نیاز احمد اسعد جہتی (گیا) سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ سول کورٹ آرہ میں چپراسی تھے۔ ۱۶ جون ۱۹۵۳ء کو وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ایک میں ہی نہیں ہوں مشکل میں کتنے پیچھے ہیں راہ منزل میں
لب خنجر نے خون کو چوسا بوئے الفت ہے تیغ قاتل میں

کالے گیسو ہوا میں اڑتے ہیں یہ بھی ہیں اک بلائے نازل میں
ہُدہُد زار مر گیا شاید پر گرے ہیں کوئے قاتل میں

maablib.org

حقیر بریلوی

حافظ فتح محمد فاروقی نام اور حقیر تخلص تھا۔ ان کی جائے پیدائش تو بریلی تھی مگر لکھنؤ میں محلہ ٹکسال میں رہائش پذیر تھا۔ گندمی رنگ کا پستہ قد آدمی تھا مولویوں کی وضع کا ٹخنوں تک لمبا کرتا۔ ڈھیلی مہری کا شرعی پجامہ اور دو پلی ٹوپی پہنا کرتا تھا۔ نہایت دیندار، وضعدار نیک طینت اور حاضر جواب تھا مادر زاد نابینا ہونے کے باوجود قرآن مجید حفظ کیا۔ قرآن خوانی اور کتب فروشی کر کے گزر اوقات کرتا تھا۔ سلسلہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا تھا اس لئے اپنے نام کے ساتھ فاروقی کا اضافہ کیا تھا۔ حافظہ بلا کا تھا جس کی وجہ سے دینی معلومات بہت عمدہ تھی۔ اکثر و بیشتر بازاروں اور اجتماعوں میں دیگر فرقوں کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کرتا نظر آتا تھا۔ باوجود جہل کے جس موضوع پر زبان کھولتا بے تکلف بولا چلا جاتا۔ تقریر بہت صاف اور واضح ہوتی جس کی وجہ سے حقیر کی ناخواندگی کا ذرا بھی پتہ نہ چلتا۔ باوجود نابینا ہونے کے اس نے دو کتابیں "شریعت آرہ" اور "کلام بےنظیر" تالیف کیں جو اس کی زندگی ہی میں شائع ہو گئیں تھیں۔

قدرت نے حقیر کو بے پناہ ذہانت و موزونیت سے نوازا تھا شاعری کی طرف جب طبیعت مائل ہوئی تو حمد و نعت سے اس کی ابتداء کی اور خود کو اسی صنف تک محدود رکھا۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

مخمسہ

ہیں ارض و سما سب تہ فرمان محمدؐ ۔۔۔ ہے ظلِ خدا سایہ دامانِ محمدؐ

کس طرح یہ مخلوق ہو قربانِ محمدؐ   لولاک کہ نازل شدہ در شانِ محمدؐ
جزویست ز اوصافِ فراوانِ محمدؐ

نعت نبوی خامہ سے کس طرح رقم ہو   اللہ ہو قرآں میں خود جس کا ثناگو
تعریف لکھے اسکی نہیں تاب بشر کو   از بندہ بیچارہ چہ آید صفتِ او
جبریلِ امیںؑ است ثناخوانِ محمدؐ

مشتاق ہوا خالقِ اکبر شبِ معراج   بلوایا انہیں حق نے فلک پر شبِ معراج
نبیوں کو ہوئی عید میسر شبِ معراج   بر عرش چو افتاد گزر در شبِ معراج
گشتند ملائک ہمہ قربانِ محمدؐ

دروازے سے اسکے پھرے کب کوئی تہی دست   مجذوب ہو، سالک ہو، یا ہو کوئی مست
محروم ز فیضش نہ کسے شیخ نہ شاب ست   در ذاتِ شریفش ہمگی رحمتِ حق ست
ہر جملہ خلائق بود احسانِ محمدؐ

ہر مرتبے منظور ہو بینائی کی خاطر   جا کر درِ دولت پہ نبی کے ہو وہ حاضر
ہو روشنی آنکھوں میں لگا لینے سے ظاہر   خاکِ قدم اوست بہ از کحلِ جواہر
شاہانِ جہاں اند غلامانِ محمدؐ

کچھ دل میں حقیر اپنے نہیں خوفِ جہنم   بخشائیں گے خالق سے مجھے شافعِ عالم
افعال نہیں نیک ہوئے مجھ سے کسی دم   ہر چند ز حسنات تہی دست ترا ہم
غم نیست کہ دستِ من و دامانِ محمدؐ

maablib.org

حسینؔ لکھنوی

سید صادق علی خلف میر حسن لکھنوی نام اور حسینؔ تخلص تھا لکھنؤ میں چھنگا صاحب کے نام سے معروف تھے، یہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں سبزی منڈی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سادات نقوی ہونے کی وجہ سے لکھنؤ والے عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ خاندان کے اکثر بزرگ نامور مجتہد اور جید عالم ہوئے ہیں مگر بدقسمتی سے حسینؔ امی محض رہ گیا، بچپن میں والدین کے بیجا لاڈ پیار اور یاروں کی صحبتوں نے پڑھنے لکھنے نہیں دیا۔ ہر وقت مروجہ اشغال پتنگ بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی اور کبوتر بازی میں مشغول رہتا تھا۔ باپ کی رحلت کے بعد جب یاروں نے ساتھ چھوڑ دیا اور خاندانی جھگڑوں نے دنیا تنگ کر دی تو لاچار شاعری کی طرف متوجہ ہوا اور جلد ہی اس فن میں نام پیدا کر لیا۔ اگرچہ زیور علم سے قطعی محروم تھا تاہم مجتہدین کے خاندان سے تعلق کی بنا پر نیز جید علماء کے علمی فیضان نے استعداد کا پردہ کھلنے نہیں دیا، طبیعت پر چونکہ مذہبی رنگ غالب تھا اس لئے شاعری کی ابتداء سلام و نوحہ سے کی۔ اصلاح کے لئے اپنے برادر نسبتی سید محمد کاظم جاویدؔ سے رجوع کیا۔ موصوف سے جب کسی بات پر چشمک ہو گئی تو میر علی محمد عارفؔ سے مشورہ سخن کرنے لگا۔ خداداد قابلیت اور دونوں اساتذہ کی رہنمائی نے حسینؔ کے کلام میں ایسی پختگی پیدا کر دی تھی کہ ان کے کلام سے یہ قطعی باور نہیں ہوتا تھا کہ یہ امی شاعر کا کلام ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ حسینؔ نے صرف اردو زبان میں نوحہ و سلام نہیں کہے بلکہ فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا ایک نوحہ تو لکھنؤ میں بہت مشہور ہوا جس کا مطلع یہ تھا ؎

داد ہاتف ایں ندا باصد بکا در کربلا

؎ آہ! کشتہ شد غریب کربلا در کربلا

حسینؔ کا غزل گوئی کی جانب بھی میلان تھا۔ زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ بیس پچیس شعروں کی غزلیں اپنے شاگردوں کو تحریر کرا کے انہیں بخش دیتا جو وہ مقامی مشاعروں میں پڑھ کر داد تحسین وصول کرتے تھے۔

حسینؔ کا دل بہر کیف ذوقِ مرثیہ گوئی کی جانب مائل رہا۔ ان کے مرثیوں نے قبولِ عام کی سند حاصل کر لی تھی جو آج تک سوز خوانوں کی زبانوں پر ہیں۔ ایک مرثیہ کا پہلا مصرع یہ ہے۔

؎ آج مقتل میں عجب بے سر و سامانی ہے لازم

دوسرے مرثیہ کا مطلع حسب ذیل ہے۔

؎ قتل جب ہو گئے سلطانِ مدینہ رن میں

حسینؔ صرف ایک اچھی شاعر نہیں بلکہ شاعر گر واقع ہوا تھا اکثر سوز خواں تلامذہ ان کے فیضانِ سخن سے فیضیاب ہوئے ہیں۔

جناب حسینؑ جناب سکینہؑ کو ان کے چھ ماہ کے بھائی علی اصغر کی شہادت کی خبر دینے کے بعد تسلی و تشفی دے رہے ہیں۔ حسینؔ نے کس خوبصورتی سے اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

؎ دادی لئے ہیں گود میں کرتی ہیں اس کو پیار
ماں سے زیادہ چین میں ہے اب وہ شیر خوار
واں دھوپ ہے نہ لو ہے نہ دکھ ہے نہ انتشار
ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں' ہیں نخلِ سایہ دار
ایذائیں سو طرح کی تھیں دنیائے زشت میں
محسن کے ساتھ کھیلتا ہوگا بہشت میں

ایک دوسرے مرثیہ میں جناب عون و محمد پسران جناب زینبؑ کے حالات میں بیان کئے ہیں جس کا مطلع اس مصرعہ سے شروع ہوتا ہے ۔

؎ دو چاند جب طلوع ہوئے خیمہ گاہ سے

گھوڑوں کی تعریف میں کہتے ہیں۔ ؎

؎ جب اُڑ کے چمکے تو سیارے ہو گئے ۔ سرعت بڑھی تو ٹوٹتے ہوئے تارے ہو گئے
سنکی ہوئی ہواؤں کے دو دھارے ہو گئے ۔ اور منہ سے کف اُڑایا تو فوارے ہو گئے
ان کی ضیا سے کم ہے ضیا آفتاب کی
باگیں نہیں ہیں دونوں کی دھاریں ہیں آب کی

بے حکم اپنی جا سے جنبش سیماب یہ کہاں ۔ ڈھیلی ذرا ہوں باگیں تو ہوں تیر سے رواں
سو بار ہو چکا ہے زمانے میں امتحان ۔ مرکب یہ راکبوں کے ہیں ایسے مزاج داں
لشکر کی سیدھ باندھ لی، پا کر ارادوں کو
دو پریاں لیکے اُڑ گئیں دو شاہزادوں کو

مختلف اشعار :

؎ بس کر چکیں عالم کے نظارے آنکھیں ۔ باقی تھیں جوانی کے سہارے آنکھیں
پیری میں یہ خود ہیں چراغ سحری ۔ ہیں صبح کے ڈوبتے ستارے آنکھیں

؎ مٹی ہیں لطافت نہ ہو جن پھولوں میں ۔ بے سود ہیں رنگت نہ ہو جن پھولوں میں
تازہ نہ ہو روح ایک ذرا بھی جن سے ۔ کس کام کے نکہت نہ ہو جن پھولوں میں

؎ بکھرے ہوئے گیسو بھی چھپائیں گے اسے کیا
جاگے ہیں کہیں رات کو ظاہر ہے نظر سے

؎ اُڑی برقِ تبسم، تو نشیمن جل گیا
باغ میں تم شب کو کیا آئے چراغاں ہو گیا

؎ غیظ سے دیکھو فقط، قبضے پہ کیوں رکھتے ہو ہاتھ
ہر شکن ابرو کی میرے واسطے تلوار ہے

؎ شبِ وصلت کی راحت اے حسینؔ ہے عارضی بالکل
وہ پہلو سے اٹھیں تو درد پھر پہلو میں بڑھ جائے

حشر بنارسی

آغا محمد شاہ نام اور حشرؔ تخلص تھا۔ عام طور پر آغا حشرؔ کے نام سے مشہور تھے۔ یہ ۱۸۷۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آغا محمد غنی شاہ کشمیری امرتسر کی سکونت ترک کر کے مستقل طور پر بنارس میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ آغا حشرؔ ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرنے کے بعد بنارس کے جے نرائن اسکول میں بٹھائے گئے لیکن یہ اپنی افتادِ طبع اور وارفتگی کی بدولت تعلیم کا سلسلہ چھٹی جماعت سے آگے جاری نہ رکھ سکے۔ کم سنی ہی میں شعر و شاعری اور ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے تھے۔ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا تو حشرؔ نے بنارس کے معروف شاعر فائزؔ بنارسی سے تلمذ حاصل کر لیا۔ اُستاد کی توجہ اور فطری ذہانت و صلاحیت کی بدولت بہت جلد لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ان کا اندازِ بیان سادہ، رواں، شگفتہ اور دلنشین تھا۔ ان کے ہاں آورد نہیں آمد تھی جوان کی طباعی اور ذہانت کی دلیل تھی۔ حشرؔ کے کلام میں شدید جذباتیت، رومانیت، منظرکشی اور زبان و بیان کی قدرت بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے غزل، نظم اور منظوم مکالموں میں شاعرانہ صلاحیت، ذہانت اور طباعی کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ اگر تھیٹر اور فلمی دُنیا کی مصروفیت انہیں موقع دیتی تو وہ دُنیائے شاعری میں بھی منفرد مقام پیدا کرتے۔ اپنی شاعری کے متعلق خود حشرؔ نے کہا ہے ؎

یہ میری شاعری اے حشرؔ شرحِ دردِ اُلفت ہے
وہی سمجھیں گے اس کو جو زبانِ دل سمجھتے ہیں

حشرؔ نے ایک اور جگہ کہا ہے ؎

میرے ہر شعر میں اے حشرؔ مستی و رنگینی
غزل میری شبابِ یار کی تصویر ہوتی ہے

شعر کی حقیقت کے متعلق اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں ؎

حقیقت شعر کی اے حشرؔ بس یہ سمجھتے ہیں
کہ بجلی ہو اثر میں اور پانی ہو روانی میں

حشرؔ نے پاکستان کی معروف گلوکارہ فریدہ خانم کی والدہ اور ماضی کی ممتاز فنکارہ و گلوکارہ مختار بیگم سے شادی کر لی تھی۔ موصوفہ نے حشرؔ کی زیرِ ہدایت کئی فلموں میں کام کیا ہے جن میں "اندر سبھا" اور "عورت کا پیار" بہت مشہور اور کامیاب فلمیں تھیں۔

حشرؔ ۱۹۳۴ء میں بمبئی سے لاہور آ گئے تھے۔ یہاں انہوں نے حشرؔ فلمز کے نام سے اپنی فلم کمپنی قائم کر کے مشہور ڈرامہ "بھیشم پرتگیا" بنانا شروع کیا۔ مختار بیگم کی یہ آخری فلم تھی کیونکہ یہ فلم شروع کرنے کے بعد حشرؔ بیمار پڑ گئے۔ اور کچھ عرصہ صاحب فراش رہ کر ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو برِ صغیر ہند و پاکستان کے ڈرامہ کی تاریخ کا یہ روشن باب بند ہو گیا۔

حشرؔ کی شاعری میں لطفِ زبان، سادگی اور روانی کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل کلام سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے ؎

نہ چھیڑ اے ناتواں! طوفانِ فریاد آج پلکوں سے
نوائے شورِ غم سا زِ لبِ ساحل میں رہنے دے

جنوں انگیز ہے رسوا نہ کر رازِ محبت کو
یہ برقِ فتنہ ساماں پردۂ محمل میں رہنے دے

نظم شکریہ یورپ

مدتوں سے نغمۂ توحید محوِ خواب تھا
سازِ ہستیِ مسلمان تشنۂ مضراب تھا

پیکرِ احساس میں خوابیدہ رُوحِ درد تھی
شعلہ ریزی نوا ہائے اخوت سرد تھی

خوار ہیں بدکار ہیں، ڈوبے ہوئے ذلّت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوبؐ کی اُمّت میں ہیں

حق پرستوں کی اگر کی تُو نے دِلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بُت کہ مُسلم کا خُدا کوئی نہیں

"موجِ زمزم" سے ایک بند

آسمان ہے محفلِ ہستی میں میخانہ مِرا
کہکشاں ہے میری صراحی چاند پیمانہ مِرا

ہر نفس سے بربطِ گیتی پہ ہوں مضراب زن
اضطرابِ برق ہے اِک رقصِ مستانہ مِرا

ساغرِ ہستی میں ہوں ارتعاشِ موجِ نور
جلوہ زارِ زندگی ہے مجھ سے میخانہ مِرا

بارشِ مستی کے جلووں سے ہے فردوس آفریں
ہے شرابِ نور سے شاداب ویرانہ مِرا

نکہتِ صہبائے مستی سے ہے تعمیرِ حیات
دہر میں اِک موجِ رنگ و بُو ہے کاشانہ مِرا

دولتِ صبحِ قدم ہوں مایۂ شامِ حدوث
گلشنِ جنّت تو ہے رضواں ہے پیمانہ مِرا

مجموعۂ جام سے گلرنگ ہے ایک ایک حرف
بزمِ کُن کو مست کر دیتا ہے افسانہ مِرا

مختلف اشعار

یہ مانا ایک دن اس خستگی کی داد پائیں گے
تسلی دینے والے یہ تو فرمائیں مگر کب تک

لہو ہو جائے دِل گُھٹ گُھٹ کے پر آنسو نہ نکلیں گے
کریں گے ضبط مجبورِ ستم طاقت جہاں تک ہے

اے وفا نا آشنا کب تک سنوں تیرا گلہ
بے وفا کہتے ہیں تجھ کو اور شرماتا ہوں میں

مختلف اشعار

جہانِ دلبری میں دلربا تجھ سا نہیں پایا
ترے حسنِ ستم کو بھی محبت آفریں پایا

نہ پوچھ اے ہمنشیں کیوں تک رہا ہوں تیری صورت کو
مقدر کی کہانی پڑھ رہا ہوں تیرے تیور میں

اُبھری ہو آگ سینہ میں تو شعرِ گرم پیدا ہو
کہ شاعر وہ شجر ہے حشر جلتا ہے تو پھلتا ہے

مجھ کو بدل دے یا رب یا دل بدل دے اس کا
یا یہ بتا دے کیونکر زندہ رہوں جہاں میں

یہ مانا ایک دن اس خستگی کی داد پائیں گے
کریں گے ضبط مجبورِ ستم طاقت جہاں کم ہے

میں صدقے آستیں الٹو، چھری لو، ذبح کر ڈالو
یہ کیا کم جرم ہے دل کا کہ تم کو پیار کرتا ہے

یہ تو مئے انگور ہے کیا بات ہے اس کی
تو زہر بھی ہاتھوں سے پلا دے تو مزا دے

برباد دل کا آخری سرمایہ تھی امید
وہ بھی تو تم نے چھین لیا اس غریب سے

ہچکیاں آج چلی آتی ہیں پیہم اے حشر
یاد کرتا ہے کہ کوئی زود فراموش مجھے

جب آتی ہے بیوفائی پر اسے دل پیار کرتا ہے
بجا یارب وہ ستمگر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

maablib.org

حفیظ جالندھری

حفیظ الدین نام، حفیظ تخلص، شعر و ادب کا اتی سخنور اور ابوالاثر خطابات تھے۔

حفیظ ۱۴ / جنوری سنہ ۱۹۰۰ء میں جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد حافظ شمس الدین فوج کو وردیاں سپلائی کرتے تھے۔ حفیظ مروجہ دینی تعلیم کے بعد اسکول میں بٹھائے گئے مگر یہ ساتویں جماعت سے آگے پڑھ کر نہیں دیئے۔ حفیظ کی تربیت میں والدین کے علاوہ ناطق جالندھری کا بڑا ہاتھ ہے جو ذی علم و سخن سنج شخص تھے اور ملتان سے ادبی مجلہ "ساقی" نکالتے تھے جو ۱۹۰۷ء سے ۱۹۵۹ء تک جاری رہا۔ حفیظ کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دل لگاؤ تھا۔ والد نے اس شغل سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن شعر و ادب کا چسکا وہ مد بلا ہے کہ تلواروں کی جھنکار میں بھی اس کی خوش آیند آوازیں کانوں میں آیا کرتی ہیں۔ باپ کی سرزنش کے باوجود حفیظ نے شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنالیا اور منزل مقرر کرکے مستعدی سے اس پر گامزن ہو گئے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے رہے اور قافلہ بنتا گیا

آج سے چھیانوے[۹۶] سال قبل حفیظ ادبی اُفق پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ادبی دُنیا پر چھا گئے۔ انہوں نے کمالِ فن سے شاعری کو موسیقی و مصوری میں سمو کر اسے ایک نیا آہنگ بخشا۔ اپنے سحر کلام اور لحن داؤدی سے بڑے بڑے مشاعروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے غزل، گیت، نغمہ اور ترانہ میں نت نئے تجربات کئے جو بالآخر انہیں شاہنامہ اسلام کی منزل تک لے آئے ؎

ے راہ پر آ ہی گئی گردشِ ایام آخر
ہو گیا روئے سفر سوئے مدینہ میرا
معجزہ جس نے نہ دیکھا ہو وہ مجھ کو دیکھے
کس طرح ڈوب کے ابھرا ہے سفینہ میرا

پاکستان کا قومی شاعر اور ترانہ پاکستان کا خالق ہونے کا اعزاز تو انہیں بعد میں حاصل ہوا۔ اس سے پیشتر بھی ان کی شخصیت شاعرِ اسلام کی حیثیت سے برِ صغیر ہندو پاکستان میں مسلم تھی۔ اس دور میں ملک کے طول و عرض میں ہر بڑے مشاعرے اور مذہبی اجتماعات میں حفیظ کی شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ عوام و خواص گھنٹوں ان کی مسحور کن آواز سننے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ عوام کا محبوب شاعر ہونے کا ایک تاریخی واقعہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بیالیسواں سالانہ اجلاس بمقام بنارس دسمبر ۱۹۳۰ء کی بات ہے کہ بنارس کانفرنس میں ایک اختلافی مسئلہ باعث نزع بن گیا۔ جلسہ گاہ میں ہر طرف شور و غل اور ہنگامہ بپا تھا۔ مقرروں و نعت خوانوں نے جلسے کو قابو میں لانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بے سود رہی۔ دریں اثنا و سر راس مسعود جو کہ جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے۔ نیز نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی اور بابا خلیل داس چترویدی نے ملتجی نظروں سے حفیظ کی طرف دیکھا کہ وہ کچھ کریں۔ ادھر فضا میں "سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی" کی صدا پنڈال میں گونجی۔ ادھر جلسہ گاہ میں فوراً سکوت طاری ہو گیا۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ اور جلسہ شروع ہو گیا۔

بلا شبہ حفیظ فطرتاً ایک عوامی شاعر تھے۔ ابتداء ہی سے عوامی احساسات ان کے

قلب ونظر کے موضوع رہے۔ وہ اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے جسمانی وقلمی مشقت کرتے۔ راتوں کو جاگ کر فکر سخن کرتے اور مشاعرے پڑھتے تھے۔ لوگ بڑی واہ واہ کرتے لیکن ان کے چہرہ پر دُکھ کی پرچھائی محسوس نہ کر پاتے تھے۔ خود حفیظ نے بھی کبھی خود اعتمادی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی کسی سے کسی قسم کی مدد نہیں چاہی۔ وہ غیرت مند۔ خاموش طبع۔ منکسر المزاج شریف آدمی تھے۔ ساتھ ہی حقیقی دُکھوں کے محرم بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری براہ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

حفیظ نے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا وہ شاعری کے کوچہ میں تنہا داخل ہوئے۔ زمانہ کی رسم کے مطابق کسی نامور اُستادِ سخن سے شرف تلمذ حاصل نہیں کیا یا یوں کہہ لیجئے کہ انہیں کوئی اُستاد ملا ہی نہیں۔ یعنی وہ خود کوزہ و خود گل کوزہ کے مصداق تھے۔ ابتداء میں رسمی شاعری کی پھر روایتی ڈگر سے ہٹ کر اپنا راستہ اختیار کیا۔ حفیظ کو ہمعصر شعراء میں جو نمایاں مقام حاصل رہا اس کی وجہ ان کا منفرد ترنم وانداز بیان کے علاوہ ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کا وافر جذبہ تھا۔ حفیظ کا تصور عشق اگرچہ اقبالؒ کے تصور کی گہرائی نہیں رکھتا مگر لطافت میں اقبالؒ سے کسی طرح کم بھی نہیں۔ حفیظ نے شعر کے تغزل کو نہ صرف یہ کہ قائم رکھا بلکہ اس سے اُردو شاعری کے کیف و سرور کو بڑھایا ہے۔ نمونۂ کلام پیش خدمت ہے۔

غزل

؎ جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں	وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں
بحال گم ہی پایا گیا ہوں	حرم سے دیر میں لایا گیا ہوں
سپردِ خاک ہی کرنا ہے مجھ کو	تو پھر کا ہے کو نہلایا گیا ہوں

فرشتے کو نہ میں شیطان سمجھا — نتیجہ یہ کہ بہکا یا گیا ہوں
بقولِ برہمن قہرِ خدا ہوں — بتوں کے حسن پر ڈھالا گیا ہوں

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے ہیں
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

بسنتی ترانہ

لو پھر بسنت آئی ، پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ ، لبِ آبِ گنگ ، بجے جل ترنگ
من پر امنگ چھائی ، پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی

ابھی تو میں جوان ہوں کا ایک بند پیش ہے :-

ہوا بھی خوشگوار ہے ، گلوں پہ بھی نکھار ہے
ترنمِ ہزار ہے ، بہارِ پُر بہار ہے
کہاں چلا ہے ساقیا
اِدھر تو لوٹ ، اِدھر تو آ
ارے یہ دیکھتا ہے کیا
اُٹھا سبو ، سبو اُٹھا
سبو اُٹھا ، پیالہ بھر پیالہ بھر کے دے اِدھر
چمن کی سمت کر نظر ، سماں تو دیکھ بے خبر

۲
وہ کالی کالی بدلیاں
اُفق پہ ہو گئیں عیاں
وہ اِک ہجومِ مے کشاں
ہے سوئے میکدہ رواں
یہ کیا گماں ہے بدگماں ، سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیالِ زہد ابھی کہاں
ابھی تو میں جوان ہوں

عید میلاد النبی سے چند اشعار:۔

ے زندگی مردہ تھی، روحِ زندگی افسردہ تھی
خامشی تخلیق اپنے آپ سے آزردہ تھی

جلوے شرمندہ تھے اپنی خامشی تکمیل سے
عشق تھا روپوش اب تک حسن کی قندیل سے

سازِ فطرت تھی ابھی مضراب سے نا آشنا
نغمہ تھا اک لذتِ بیتاب سے نا آشنا

سو رہی تھی زندگانی خواب کے آغوش میں
آرزوئیں دم بخود تھیں حسرتِ خاموش میں

روح نے اب تک نہ عادتوں کے مزے پائے نہ تھے
خاموشی نے التجاؤں کے مزے پائے نہ تھے

عالم ایجاد تھا کچھ اس طرح یعنی نہ تھا
آفرینش لفظ تھا، شرمندہ معنی نہ تھا

منتخب اشعار:۔

ے پری رخوں کی زباں سے کلام سن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

احباب نے حفیظ تو اضع تو کی بہت
لیکن ہماری شان کے شایاں نہ کر سکے

وہ جس کی گرد میں نہ جوانی ہو نہ زر ہو
اس راہ سے اللہ نہ کرے اس کا گزر ہو

سا اللہ دنیا کا میں چھوڑوں گا تمہاری خاطر
اور تم ساتھ نہ ہو گے مجھے معلوم نہ تھا

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

ے ہے ازل سے اس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے
عشق لافانی ملا ہے۔ زندگی فانی مجھے

ے نہیں عتاب زمانہ خطاب کے قابل
تیرا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

ضمیرؔ دہلوی

نام محمد ابراہیم عرف قاری کلن اور تخلص ضمیرؔ تھا۔ یہ دہلی کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد وارث علی دہلی کے مشہور مزاح گو تھے اس لئے ضمیرؔ کو بھی یہ فن ورثہ میں ملا تھا۔ باوجود بے علمی کے فن سخنوری اور مزاح گوئی میں خوب نام پیدا کیا۔ اس فن میں بہاؤالدین عرف عبداللہ شاہ بشیرؔ سے شاگردی کا شرف حاصل تھا۔

نمونۂ کلام یہ ہے :-

غزل

نہ پہیں انتہائے گردش آسماں
کو ہر استخواں کا ردا ہو گیا

زرخ پُر ملاحت کا بوسہ ملا
نمک خوار میں آپ کا ہو گیا

جو عظم شب کے خاصے میں سے بچ رہا
وہی صبح کا ناشتہ ہو گیا

لب شیریں کی یاد میں اے ضمیرؔ
جو پھلکے تلے، گلگلا ہو گیا

ایک دوسری مزاحیہ غزل بھی ملاحظہ کیجئے :-

خوان نعمت ہے یہ گھر یا تذکرہ
جس کے بھوکے بیٹھے ہیں سب خاص عام

یہ نئی باتوں کا گوشکا ہے بنا
جس کی تاحشر رہے گی دھوم دھام

دیکھنا شیریں کلامی کا اثر
اس کا ہر فقرہ ہے گویا میٹھا آم

دال روٹی سے جو ہیں خوشحال لوگ
ان کو یہ اک شغل ہے ہر صبح و شام

دیکھنے میں اس کے کیسی اشتہا
ہونے دو ہوتا ہے گر ٹھنڈا طعام

ہیں مصنف اس کے میرے مہرباں
داورس ہیں دال پر ہے ان کا نام

ہے تخلص ان کا نادر اور لقب
درگا پرشاد محبت القیام

پیٹ کی خاطر لکھا میں نے یہ سال
میں بھی ان باتوں کا بھوکا ہوں مدام

بس یہی لکھ دے قلم لے کر ضمیرؔ
ہے عجب چٹ پٹا طرفہ کلام

مختلف اشعار

فقرے تمہارے چھڑکے ہوئے نون مرچ کے ‎ ‎ کیا چٹ پٹے بنے ہیں دم بھر کے مصالحہ دار

روکھی سوکھی بھی آبرو سے ملے ‎ ‎ یہ بھی اس وقت میں غنیمت ہے

؎ تار نفس سے ہے ہم اُلجھا ہوا یہ تار ‎ ‎ نکلے گا دم بھی ساتھ جو نالہ رسا ہوا

؎ ظلم ہم پر ذرا سمجھ کے کرو ‎ ‎ اے بتو! بندۂ خدا ہیں ہم

؎ واہ ان کا خط کب آیا ہے کہ فرطِ ضعف سے ‎ ‎ کھولنا مشکل ہے خط بالِ کبوتر سے ہمیں

خضر دہلوی

مرزا خضر سلطان نام اور خضر ہی تخلص تھا۔ یہ بادشاہ ہند حضرت بہادر شاہ ظفر کے فرزند ارجمند تھے فن شاعری میں نواب اسداللہ خاں غالب کی شاگردی کا شرف حاصل تھا یہ ۱۸۳۱ء میں لال قلعہ دہلی میں پیدا ہوئے اور قلعہ ہی میں دیگر شہزادوں کی طرح رسمی تعلیم ہوئی۔ شاعری اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی۔ غالب جیسے نادر روزگار شاعر کی اصلاح نے خضر کی شاعری میں چار چاند لگا دیئے تھے شعر گوئی کے لئے مضامین کی تلاش اور اظہار خیال کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب عمدہ تھا۔ افسوس ان کا کلام آشوب غدر میں تلف ہوگیا۔ غدر کے اختتام میں لیفٹیننٹ ہڈسن انہیں۔ ان کے بھائی مرزا مغل اور بھتیجے مرزا ابوبکر کو مقبرہ ہمایوں سے گرفتار کرکے دہلی لا رہا تھا کہ راستہ میں ناچاقی ہوگئی۔ اور ہڈسن نے انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔

نمونہ کلام پیش خدمت ہے:

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر
غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا

لہو میں میرے رنگین ہوں اگر دیکھوں تو یہ دیکھوں
انہوں کے ہاتھ پر رنگ حنا دیکھا تو کیا دیکھا

نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں کچھ میری
ہمیں اس وقت میں اے بیوفا دیکھا تو کیا دیکھا

؎ کہتے ہو وہ بھی ہوس پیشہ ہے جیسا تو ہے — مجھ سے اک چھیڑ ہوئی شکوہ عدو کا نہ ہوا

؎ گال سے کون خوش ہو مگر حسن اتفاق — جو تیری خو تھی وہ ہی میرا مدعا ہوا

؎ کہتے ہو کہ ایک روز تجھے قتل کریں گے — پر یہ بھی تو اسے شوخ ستمگر نہیں ہوتا

خلیفہ دہلوی

اچھے نام اور خلیفہ تخلص تھا۔ دلّی میں مو تراشی کا پیشہ تھا۔ بالکل اَن پڑھ لیکن بے حد ذہین اور مزاج گو تھا۔ نہایت خود پرست اور چڑچڑا مزاج واقع ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ناراض ہو کر لوگوں کی ہجو میں کہنا معمولی بات تھی۔ خود کو شاعر کہلانے کا بے حد شوق تھا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق کسی سے تلمذ حاصل نہیں کیا۔ اپنی سمجھ بوجھ کے لحاظ سے جو موزوں کرتے کسی لکھے پڑھے سے لکھوا کر رکھ لیا کرتا تھا۔

لاپرواہی و جہل کی وجہ سے کلام تلف ہو گیا۔ چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں جو درج کیے جاتے ہیں ؎

؎ خلیفہ مر مٹا آخر ادائے خوبرویاں پر
جوانا مرگ مرنے کا بڑا ارمان رکھتا تھا

؎ کچھ بھی خسرو کی خطا یا جبر شیریں کا نہ تھا
تو نے اپنی جان دی فرہاد اپنے ہاتھ سے

؎ خلیفہ کو نہ ٹالو اے حسینوں ایک بوسے پر
کیا تھا اور جو وعدہ اسے بھی اب وفا کر دو

خالصؔ بھوپالی

حافظ سلیمان خان نام اور خالصؔ تخلص تھا۔ ریاست بھوپال کا رہنے والا تھا۔ نابینا ہونے کی وجہ سے حافظ نابینا کے نام سے مشہور تھا۔ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ حدیث اور تفسیر کا اچھا علم رکھتا تھا۔ موصوف نے ساری زندگی بھوپال کی موتی مسجد میں گزار دی مگر شعر گوئی کا شوق انہیں حجرۂ مسجد سے میخانۂ سخن میں کھینچ لایا۔ بھوپال میں کوئی مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں خالصؔ شریک نہ ہوتا ہو۔ مشوق علی خان جوہرؔ کے خاص شاگرد رہنے کی وجہ سے ہر محفل میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ قدرتی صلاحیت کے علاوہ سخت محنت سے اپنے کلام میں صفائی اور جاذبیت پیدا کر لی تھی۔ بھوپال کے اچھا کہنے والوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے۔

طور پر بھی نہ کبھی کوئی جسے دیکھ سکا — میرے ہر گوشۂ خاطر میں وہ تنہا نکلا
معتقد شیخ کے اب خاک رہیں ہم وہ تو — شائقِ حور جنان مائلِ غلماں نکلا

غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے

حسینوں کی اُلفت بھی کیا ہو گئی — کہ آفت میں جاں مبتلا ہو گئی
تیری یاد اب دل سے جاتی نہیں — یہ کافر بھی تیری ادا ہو گئی
سُنا ہے عیادت کو آتے ہیں وہ — الٰہی مجھے کیوں شفا ہو گئی

کٹے کس طرح زندگی کا وبال — اجل بھی تو ہم سے خفا ہو گئی

دوست سرحدی

منشی دوست محمد خاں نام اور دوست ہی تخلص تھا۔ یہ قوم کا پٹھان اور معمولی لیاقت کا آدمی تھا۔ موزنی طبع کے سبب شعر کہتا تھا۔ روزانہ طبع آزمائی سے کافی ذخیرہ کلام جمع ہو گیا جو بعد میں دیوان کی صورت میں شائع بھی ہوا۔

موصوف کے چند اشعار حاضر ہیں ؎

پوچھتے کیا ہو شب فرقت کا حال
دل ہمارا رات بھر تڑپا کیا

جو تیری جدائی کا غم دیکھتے ہیں
وہی جلد راہ عدم دیکھتے ہیں

سچ کہو، رہتے دو بہانے کو
کس نے روکا ہے آنے جانے کو

جو کیا ہم نے عشق میں تیرے
نہ کرے اب خدا کرے کوئی

زباں سے ہی کہتے ہو مرتے ہیں ہم تم پر
نہیں مرتے او دوست مر جانیوالے

دلؔ علیگڑھی

زور آور خاں نام اور دلؔ تخلص تھا۔ یہ کول ضلع علی گڑھ کا رہنے والا معمولی لیاقت کا آدمی تھا۔ محض شوق و موزونیِ طبع کی مدد سے شعر کہتا تھا تاہم اچھا کہنے والا خیال کیا جاتا تھا۔ موصوف نے متعدد مثنویاں اور ضخیم دیوان چھوڑا ہے،
درج ذیل چند اشعار اس دیوان سے پیش کئے جاتے ہیں۔

یہ نہیں خوب مجھے دن ہو تجھے رات پسند
دوستی جب ہے کہ ہم تم کو ہو اک بات پسند

ساقی نے جو پلایا مجھے میں نے پی لیا
زاہد تجھے خبر ہے حلال و حرام کی

جس روش سے میں کھلاتا ہوں یہ مضمون کے گل
نہ کھلیں باغ طلسمات میں افسوں کے گل

کیا سینہ کو وا کس نے لگائی آگ گلشن میں
عیاں ہیں داغ حسرت لالۂ حمرا کی چھاتی پر

گل ہیں مکھڑے سے خجل اور آنکھ سے نرگس کے پھول
باغباں تیری نذر کو چمن کے لاؤں کس کے پھول

دلؔ میرے دیوان کو عالم نہ سمجھے ریختہ
جمع ہیں گلشن میں میرے ہند اور فارس کے پھول

دلگیر اکبرآبادی

شاہ سید نظام الدین نام اور دلگیر تخلص تھا۔ یہ ۲۳ر فروری ۱۸۸۳ء میں محلہ میوا کٹرے آگرہ میں پیدا ہوا۔ دلگیر کے والد سید عبدالقادر شاہ قیصر اکبرآبادی کے اولیاء میں سے تھے جن کا سلسلہ نسب حضرت سید عبدالقادر شاہ بغدادیؒ تک پہنچتا ہے جو علم خلافت لے کر قدیم ہندوستان میں وارد ہوئے، یہ علم دو سیر سونے کا تھا جو شاہ دلگیر ہر ماہ کی گیارھویں تاریخ کو اپنی درگاہ میں استادہ کرتے تھے۔

خاندانی تنازعوں کے باعث تعلیم کی تکمیل نہ کر سکا تاہم ذاتی شوق اور محنت سے فارسی، عربی اور اردو میں خاص لیاقت پیدا کر لی تھی۔ شعر گوئی کا بچپن سے شوق تھا فن شاعری میں کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں کیا۔ خود ہی شعر موزوں کرتا تھا۔ اشعار میں شستہ زبان، جدتِ خیال، تلاشِ مضمون اور روزمرہ کی جملہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مشاعروں میں کلام پڑھنے کا انداز بہت دلکش اور مؤثر تھا۔ سنہ ۱۰-۱۹۰۹ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں اپنے کلام دلپذیر سے حاضرین کو محظوظ کیا کرتا تھا وہ پیشِ خدمت ہے۔ پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔

غزل

کیوں نہ دھوکا ہو دہکتے ہوئے انگاروں کا
شعلۂ طور ہے جلوہ ترے رخساروں کا

سایۂ دامنِ رحمت میں ہیں عاصی زاہد
دیکھ کیا حشر میں رتبہ ہے گنہگاروں کا

جل اٹھا آتشِ دل سے مری ہر سنگ شرار
ڈھیر ہے بعد فنا قبر پہ انگاروں کا

ہار پھولوں کے لئے پھرتی ہیں حورانِ خیال
آج فردوس میں میلہ ہے گنہگاروں کا

تیرے آنے کی خبر جب کبھی مل جاتی ہے
موت منہ دیکھ کے رہ جاتی ہے بیماروں کا

جنابِ خضر سے کہہ دو عبث جینے پہ مرتے ہیں
نہ ہو کھٹکا اجل کا تو مزہ کیا زندگانی کا

چلا ہے نجد کی جانب جو کھینچ کر ناقۂ لیلیٰ
غبارِ قیس کو عہدہ ملا ہے پاسبانی کا

غزل میری نہ تھی دلگیر کچھ توصیف کے قابل
مگر مشکور ہوں اہلِ سخن کی قدردانی کا

دلگیر کی ایک دوسری غزل کے چند اشعار حاضر ہیں۔

کیا قیامت میں قیامت ہیں ادائیں ان کی
دیکھ کر مجھ کو کن انکھیوں سے وہ شرما جانا

دم آخر ہے ٹھہر جاؤ میری بالیں پر
ابھی آئے ہو، ابھی جاؤ گے جانا جاناں

وہ سمجھتے نہیں کچھ بھی یہ سمجھ ہے ان کی
کہ مجھے غیر کیا، غیر کو اپنا جانا

پہنچے دلگیر وہاں سن کے حسینوں کا ہجوم
عرصۂ حشر کو بھی کیا کوئی میلہ جانا

نہ مرتے مجھ کو بنتی ہے نہ جیتے مجھ کو بنتی ہے
نہ دل ہے میرے قابو میں، نہ میں قابو میں ہوں دل کے

جو ہوں تو کچھ نہیں، ہونا مرا نہ ہونا ہے
کسی کے وعدۂ فردا کا اعتبار ہوں میں

---

maablib.org

ڈھینڈس بھوپالی

حاجی قمر علی خاں نام ڈھینڈس تخلص تھا۔ یہ بہت معمولی لیاقت کا آدمی تھا۔ اور ریاست بھوپال کی فوج میں ملازم تھا، بھوپال کے ہزل گو شعراء میں بہت مشہور تھا۔ حکیم معشوق علی خاں جوہر کا شاگرد تھا۔ معمولی استعداد کا آدمی تھا مگر اُستاد کی توجہ و اصلاح کی وجہ سے برجستہ و فی البدیہہ کہنے کا کمال رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ محرم کے مہینے میں کسی نے ڈھینڈس کو کھچڑا کھلایا۔ کھانے کے بعد میزبان نے پوچھا۔ کہیئے کھچڑا کیسا ہے؟ انہوں نے فی البدیہہ کہا۔ ؎

کھلایا بھی تو کھچڑا آپ نے ماہِ محرم کا
بنا بیٹھا رہے گا پیٹ میں چہلا مرے غم کا

ایک صاحب نے فارسی کا مشہور مصرع پڑھا تو ڈھینڈس نے مصرع ثانی کہہ کر شعر پورا کر دیا ؎

اس عراق کی لحد پر رات بھر مشعل جلے
بر مزارِ ما غریباں نے چراغِ نے گلے

نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال کے عہد میں سڑک کے بائیں جانب چلنے کا رواج ہوا تو ڈھینڈس نے اپنے خیال کا اظہار اس طرح کیا ؎

آدمی کی بائیں پسلی سے حوا کا ہے ظہور
عورت جو حکمران ہے تو بائیں طرف چلو

جب بھوپال میں اعلیٰ عہدوں پر بیرونجات کے قابل اشخاص کو مقرر کیا جانے لگا تو ڈھینڈس نے کہا ؎

پردیسی ڈاکوؤں نے بھوپال لوٹ ڈالا
آئے ہیں یہ لٹیرے جانے کہاں کہاں سے

ڈھینڈس کی ایک طنزیہ نظم کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے۔

پڑھ کے انگریزی جو کالے یہاں آجاتے ہیں
مثل گوروں کے بسر زندگی فرماتے ہیں

واقعی حضرت ڈھینڈس کی ہے داڑھی نیچی
جن کے داڑھی نہیں وہ دیکھ کے شرماتے ہیں

ڈھینڈس کے مزید چند اشعار حاضر ہیں ؎

؎ بنایا قطرہ ناپاک سے خالق نے انسان کو
گھمنڈ کس بات پر کرتا ہے ڈھینڈس جبکہ یہ تو ہے

؎ خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہے اے ڈھینڈس
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

؎ اب کیا رہا ہے وقت خزاں جا انہی سے مل
جن باغیوں نے لوٹ لئے دن بہار کے

؎ انساں کو چاہیئے کہ خیال قضا رہے
ہم کیا رہیں گے جب نہ رسولِ خدا رہے

ذہینؔ بجنوری

حافظ مولوی حکیم نورالحسن نام، ذہینؔ تخلص تھا۔ یہ کیرت پور نہٹور ضلع بجنور کے سادات رضوی گھرانے کے چشم و چراغ تھا۔ والد مولانا محمد ظہورالحسن ضلع بجنور کے مشہور و بے مثال فضلاء میں سے تھے، ذہینؔ پیدائش کے پانچ سال بعد کسی بیماری کی وجہ سے نابینا ہوگیا تھا اس لئے باقاعدہ تحصیل علم کا موقع نہیں ملا۔ تاہم اسی حالت میں قرآن مجید حفظ کیا اور فن طب حکیم مولوی رحیم اللہ بجنوری سے حاصل کیا۔

فن سخنوری کا بیحد شوق تھا۔ موزونیت اور شوق کی وجہ سے شعر کہتا تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی و عربی میں فکر سخن کرتا تھا۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

غزل

فتنے پس پس گئے، دب دب گئے محشر کیا کیا
فتنۂ قامت جو مرے گھر سے خراماں نکلا

آبلے پھوٹ کے روئے مری تنہائی پر
کف پا سے جو کوئی خار مغیلاں نکلا

بعد مردن وہ عیادت کے لیے آتے ہیں
جان نکلی ہوئی آئی، میرا ارمان نکلا

ایک دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

فتنہ زا ہے تری وزدیدہ نگاہیں کیسی
لاتی ہے مملکت دل پہ تباہی کیسی

مجھ سیاہ بخت کا جب نام لکھا دفتر میں
پھیل تقدیر کے دفتر میں سیاہی کیسی

حسرت و یاس و الم ساتھ چلے قبر میں بھی
دیکھنا میرے رفیقوں نے ستاہی کیسی

کیا اسی رات سے ہے صبح قیامت کی نمود
شب فرقت میں ہے اللہ سیاہی کیسی

؎ جمائی دم بدم لیتے ہیں وہ آنکھوں کو مل مل کر
اشارہ ہے مری جانب کر آؤ سو رہیں چل کر

؎ دل و جاں دین و ایماں ایک ادا میں چھین لیتے ہیں
کوئی دیکھے کرشمے اس بت کافر کی چھل بل کے

ذرّہ اکبر آبادی

میر ولایت علی نام، ذرّہ تخلص تھا۔ کول، اکبر آباد (آگرہ) میں رہتا تھا۔ نہایت بااخلاق اور نیک خو شخص تھا، اگرچہ معمولی لیاقت کا آدمی تھا مگر کلام سے فصاحت نمایاں ہے۔ کلام ملاحظہ کیجئے۔

غزل

ان بتوں کی ہمیں اُلفت سے بھلا حاصل کیا
ناخدا ترس سے جز رنج و عنا حاصل کیا

میں دُعا دیتا ہوں تم گالیاں دیتے ہو مجھے
اس بُرا کہنے سے کہئے تو بھلا حاصل کیا

کیا ملے گا میرے سودائی بنانے سے تجھے
پیچ دینے سے مجھے زلف رسا حاصل کیا

قطع کرنا تھا مرے دست جنوں کو ناصح
کیوں گریباں میرا تو نے سیا حاصل کیا

دست قاتل کو مبارک رہے خونِ عاشق
پاؤں کیوں پڑتی ہے ناحق تو حنا حاصل کیا

عمر بھر خاک ہی چھانا کیا میں اے ذرّہ
اور ان مہر وشوں سے تو ہوا حاصل کیا

استخواں میرے نہ کھا مجھ کو ندامت ہوگی
اے ہما گر کبھی مہماں سگِ جاناں ہوگا

ذوقی رامپوری

محمد میاں نام، ذوقی تخلص تھا۔ یہ ۱۹۲۳ء میں مصطفےٰ آباد ریاست رامپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شہزادے میاں اسکول ماسٹر تھے اور اچھے شاعر خیال کئے جاتے تھے، ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد ذوقی کو مدرسہ عالیہ رامپور میں داخل کیا گیا مگر نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کر سکا۔ حصول معاش کے لئے خوشنویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ تھوڑی سی محنت اور دلچسپی کی وجہ سے اخبارات کی کتابت کرنے لگا۔

شاعری کا ذوق باپ سے ورثہ میں ملا تھا تاہم اصلاح کلام کے لئے رامپور کے مستند شاعر متے میاں صابر سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ استاد کی توجہ سے کلام میں پختگی پیدا ہوگئی اور انہیں ہر محفل میں ذوق و شوق سے سنا جانے لگا۔ مجموعہ کلام "نقش قدم" بزم شعراء رامپور نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس سے نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

ے کب تلک رسم و روایات کے محبت — ہر نئی بات نہ ہونے دیں گے
ہو تو سکتا ہے کوئی میرا مگر — میرے حالات نہ ہونے دیں گے
یوں مناتے ہیں نئی صبح کا جشن — جیسے اب رات نہ ہونے دیں گے

مختلف اشعار:۔

ے یہ بھی سوچا ہے بے خبر کلیوں — اس تبسم کی انتہا کیا ہے
ے جو بزرگوں نے سر دار کہی ہیں ذوقی — ہم وہ باتیں سر بازار نہیں کہہ سکتے
ے ہم کو گم کردہ راہ کہتے ہیں — راہبر خود تو راہ پر آئیں
ے عجب چیز ہے ذوقی یہ دل کی مجبوری — کہ ہم جواب نہ پائیں مگر سلام کریں
ے آشیاں خود ہی جل گیا ہوگا — باغباں کا کوئی قصور نہیں

روشن دہلوی

مرزا جہاں اشرف گورگانی ولد مرزا جہاں نگیر اشرف گورگانی نام، روشن تخلص تھا۔ ۱۸۴۳ء دہلی میں شاہی خاندان میں پیدا ہوئے، نہایت حسین وجمیل تھے مگر بالکل ناخواندہ ۔ شعرگوئی کا از حد شوق تھا۔ اس فن میں اُستاد بیخود کے خرمن فیض سے بہرہ ور تھے۔ جو کچھ موزوں کرتے اسے دوسروں سے لکھوالیتے تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

غزل

اس کی قدرت یہ اس کی شان ہے ۔۔۔ خاک میں گویائی پیدا ہوگئی
خاک کے پتلے میں بھر دیں شوخیاں ۔۔۔ شان خالق کی تماشا ہوگئی
قدِ آدم ڈھل گئی تصویر یار ۔۔۔ آنکھ کی پتلی بھی سانچا ہوگئی
کیوں نہیں ملتا ہے مجھ سے تو بتا ۔۔۔ بیوفا ایسی خطا کیا ہوگئی
اس کے لب ہلتے ہی روشن جی اُٹھے ۔۔۔ بات کافر کی مسیحا ہوگئی

روشن کی ایک دوسری غزل کے چند اشعار ؎

تڑپ تڑپ کے گزاری ہے رات بھر ہم نے ۔۔۔ وہ کہہ گئے تھے کہ آئینگے ہم چراغ جلے
دکھائے جلوہ جو داغ جگر پس مردن ۔۔۔ ہماری قبر پہ آٹھوں پہر چراغ جلے
سنائیں سوزشِ فرقت کا حال کیا روشنؔ ۔۔۔ وہ آگ بھڑکی کہ سارے جگر کے داغ جلے

تری جھڑک بھی خوشی کے ساتھ ہے ۔۔۔ دل لگی دل کی لگی کے ساتھ ہے
دردِ دل جاتا ہے کوئی چارہ گر ۔۔۔ یہ ہماری زندگی کے ساتھ ہے
لڑکے جاتے ہو کہاں روشن سے تم ۔۔۔ لطف جانے کا خوشی کے ساتھ ہے

رسا دہلوی

رفیق احمد نام اور رسا تخلص تھا۔ دہلی میں محلہ سوئیوالان میں رہتے تھے۔ معمولی لیاقت کے آدمی تھے مگر شعر دلی کی ٹکسالی زبان میں کہتے تھے۔ بچپن میں یتیمی کا داغ اٹھانے کی وجہ سے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ بس ماں، دو بھائی اور دو بہنیں تھیں جو بیلن وسنو بنا کر بیچتے تھے۔ اس سے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اسی میں گزر بسر کرتے تھے۔ ماں کے انتقال کے بعد آبائی رہائشی مکان اپنی بہن کی اولاد کو دے کر خود حاجی ہوٹل عقب جامع مسجد میں اٹھ آئے تھے۔ دن ہوٹل میں گزارتے اور رات درگاہ شیخ کلیم اللہ واقع پریڈ گراؤنڈ میں بسر کرتے تھے۔ اسی برس کی عمر میں حاجی ہوٹل ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ حاجی ہوٹل کے مالک حاجی ظہور الدین سے جو کرکٹ کی دنیا میں مولانا کے نام سے مشہور تھے اور مغل ٹیم کے گول کیپر تھے اُستاد رسا کا یارانہ تھا۔ یہ اُستاد کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ رسا صاحب کو شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ اُستاد بیخود کے چہیتے شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ بیخود اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ دلی میں اُستاد کے نام سے معروف تھے۔ ہر صنف سخن میں قدرت حاصل تھی۔ سہرا بھی خوب کہتے تھے۔ اپنے دوست حاجی ظہور الدین کے صاحبزادے فیاض الدین کی شادی کے موقع پر اُستاد رسا نے جو سہرا کہا تھا وہ حاضر خدمت ہے۔

قرنوں کی جان ستارۂ زہرہ شاں سہرے میں ہے
حاصلِ ذوق نشاطِ دلبراں سہرے میں ہے

داستانِ حسنِ یوسف پڑھنے والے دیکھ لیں
دیکھ لیں سہرے میں جھک کر کیا نہاں سہرے میں ہے

ساعتِ مسعود آئی ہے کہ پیغامِ نشاط
عشرتِ جاوید کا فرخ نشاں سہرے میں ہے

قدرِ گوہر شاہ داند ہے حقیقت میں بجا
گوہرِ نادر کا بیشک قدرداں سہرے میں ہے

عارفِ سرِ خفی و واقفِ رمزِ جلی
خلوت و جلوت کا سچ مچ رازداں سہرے میں ہے

رحمتِ یزداں سے ہے فیاض صدرِ انجمن
کامیاب و کامگار و کامراں سہرے میں ہے

جان و دل سے جبہ شاہی عروسانِ بہار
وہ گلِ رعنا گلِ گلستاں سہرے میں ہے

آج ہیں عشرت بداماں حضرت حافظ ظہور — لخت دل سیارہ انکا ضوفشاں سہرے میں ہے
کیا نہ ہوگی خلد میں خوش روح نورالدین کی — انکے دل کی جو تمنا تھی جواں سہرے میں ہے

حسن والوں نے قسم کھا کر کہا مجھ سے رسا
حسن کی عصمت کا واحد پاسباں سہرے میں ہے

اُستاد رسا کا ایک قطعہ اور چند اشعار پیش ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

قطعہ

جوتش کے نتیجے یہ ہے تاثیر زحل کی — نکلا ہے قمر آج صعوبت ہے زحل کی
آئی ہے گھڑی چین کی ، آرام کی ، کل کی — راحت کی ، مسرت کی ، عزائم کی عمل کی

زہرہ سے قمر آکے گلے آج ملا ہے
اک برج شرف میں شرف دو کو ہوا ہے

چند اشعار

جوش میں آئیں تو دامن کی اُڑا دی دھجیاں
ہوش میں آئے تو کانٹوں سے رفو کرنے لگے

؎ دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا — وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا
؎ عید کے دن بھی سر کو دھنتا ہے — میں ہوں نہ بھٹ تو یاد گھٹتا ہے
لوگ کہتے ہیں اس کو عید کا چاند — میں یہ کہتا ہوں نون غنہ ہے

؎ مجنوں کو حماقت سے اناڑی سمجھا — فرہاد کو مزدور پہاڑی سمجھا
ساغر جو دیا ساقی بالا قد نے — میں بادہ انگور کو تاڑی سمجھا

رِند دہلوی

نواب مہربان خاں نام اور رِند تخلص تھا۔ نواب احمد خاں بنگش فرخ آبادی کی دیوانی میں ملازمت کرتا تھا۔ کچھ دن نواب افراسیاب خاں کی سرکار میں بھی متوسل رہا۔ بالکل جاہل تھا حتیٰ کہ تلفظ بھی درست نہ تھا تاہم شاعری سے دلی لگاؤ تھا۔ پہلے مرزا رفیع سوداؔ سے شرف تلمذ حاصل کیا بعد ازاں میر سید محمد سوز کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوگیا۔ باوجود بے علمی شعر عمدہ کہتا تھا۔ اکثر اس کے بنائے ہوئے ٹپّے اور دوہے لوگ گاتے پھرتے تھے۔ موسیقی سے بھی شغف رکھتا تھا۔ آخر عمر میں مرزا قتیل کے ساتھ رستم نگر لکھنؤ میں رہنے لگا تھا۔ یہیں انتقال ہوا۔ اور حاجی نصرت کے تکیے میں دفن ہوا۔

نمونہ کلام یہ ہے :-

رات کو اُمید ہے کچھ دن کو ہو جاتا ہے کچھ
بے وطن، بے رفیق، بے اسباب
ترستے رہ چلے دُنیا سے ہم او بیوفا ظالم
کبھی جو روبرو جاتا ہوں تو کہتا ہے جھنجلا کر
غنیمت ہے جس ڈھب کٹے زندگانی
یارب کہیں سے گرمیٔ بازار بھیج دے

کیا کروں شکوہ الٰہی گردشِ افلاک کا
کون ایسا غریب ہووے گا
نہ دیکھا مرتے مرتے آخری دیدار یا قسمت
پرے ہو سامنے میرے سے چل لے او فریادی کی صورت
کہاں دن، کہاں غم، کہاں یار جانی
دل بیچتے ہیں کوئی خریدار بھیج دے

رمز دہلوی

صاحب عالم مرزا فخرالدین عرف مرزا فخرو الملقب بہ مرزا چپاق نام فتح الملک شاہ بہادر خطاب اور رمز تخلص تھا مرزا فخرو دلی کے آخری تاجدار سراج الدین ظفر کے منجھلے بیٹے تھے، مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولیعہد سلطنت کے انتقال کرنے کے بعد ۱۸۴۹ء میں ولیعہد مقرر ہوئے، نہایت حسین وجمیل شہزادہ تھے. گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، لمبا قد، چوڑا اشتقاف سا تھا، تیموری ڈاڑھی، چنگیزی ناک، مغلئی ہاڑ جوانی دیکھنے والے ٹھنڈی سانس لیتے تھے۔ لال قلعہ چھوڑنے کے بعد جب تک پیسہ ہاتھ میں رہا خوب الٹے تلّلے سے زندگی گزاری۔ شاید ہی کوئی بازی ان سے چھوٹی ہو۔ کبوتر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی، پٹا بازی۔ بھیراکی اور ستار نوازی میں طاق تھے ہر فن مولا ہونے کے باوجود انتہائی منکسر اور خدا ترس بھی تھے، غدر کے بعد جب دہلی والے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے اس مرد قلندر نے لنگر جاری کیا ہوا تھا جس میں حلوہ چپاتی عام طور سے تقسیم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے عوام میں مرزا چپاتی کے نام سے مشہور ہوگئے۔

لاڈ پیار کا یہ عالم تھا کہ گیارہ برس کی عمر تک گودوں میں پھرتے تھے لکھنا پڑھنا تو خاک نہ آیا البتہ فطری موزونیت اور قلعہ کے ماحول نے شاعر ضرور بنادیا استاد ذوق کا شرف تلمذ حاصل تھا۔ استاد کی توجہ، فطری موزونیت اور محنت سے نہایت اچھا کہتے تھے۔ اسی وجہ سے مشاعروں میں بلا کی دھوم تھی۔ حافظہ بلا کا تھا۔ سو سو بند کے مسدس ازبر تھے تو تلے اور بہرے بھی غضب کے تھے، جب تک گلا پھاڑ کر نہ چیخو ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ مشاعروں میں تتلا کے پڑھتے تو لوگ اور بھی محظوظ ہوتے ان کے اکثر اشعار دلی والوں کو ازبر ہوگئے تھے۔ اسی ایک شعر پر تو رمز نے ایک مشاعرہ ہی

لوٹ لیا ؎

بنائی شوق میں شداد نے پر یہ نہ سمجھا تھا
نہ میں جنت کے قابل ہوں نہ جنت میرے قابل ہے

ایک مسالمہ میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

ایک زمانہ میں ان کی غزل کا درج ذیل شعر بہت مشہور ہوا جو دلی میں بچے بچے کی زبان پر تھا ؎

یا پنجتن بچانا جب جان تن سے نکلے
نکلے تو یا محمد کلمہ دہن سے نکلے

رمز کے تین اشعار اور یاد آگئے وہ بھی ملاحظہ کیجئے۔ اور ان کی قادر الکلامی کی داد دیجئے۔ ؎

صراف کسوٹی پہ گھسا کرتے ہیں زر کو — ہم وہ ہیں جو آنکھوں سے پرکھتے ہیں بشر کو
دل دل کے ہیں جو تیس عدد حرف بھی دو ہیں — بے دیکھے سمجھ لیتے ہیں ہم زیر و زبر کو
ان چاروں کو جادو ہے تم دیکھا ہے فخر و — ایک حسن کو، آواز کو، دولت کو ہنر کو

رمز کے آخری ایام عسرت و تنگدستی میں گذرے، ترا ہیرم خان (لال کنواں) پر پتنگ سازی کی دوکان تھی۔ اکثر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کبوتر اور پتنگ بیچ کر پیٹ پالتے تھے، جس کے دروازہ پر کبھی دھن برستا تھا وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگیا۔ غدر میں سینکڑوں کا پیٹ پالنے والا خود فقر و فاقہ میں گذر کر کے بالآخر ستمبر ۱۹۴۰ء میں ہیضہ میں مبتلا ہو کر اس جہان گذران سے گذر گئے اور قطب صاحب میں مدفون ہوئے۔

نمونہ کلام پیشِ خدمت ہے، پڑھیئے اور اس امی شہزادہ کے کلام کی داد دیجئے۔
ایک پڑھا لکھا آدمی بھی اس سے بہتر کیا کہہ سکتا تھا ؂

غزل

غم وہ کیا ہے جو جان گزا نہ ہوا — درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
حال کھل جائیں غیر کے سارے — پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر — بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
وہ تو ملتا پرائے دل کم ظرف — تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
شکوہ یار اور زبانِ رقیب — کھیل ٹھہرا کوئی گلا نہ ہوا
تم رہو اور مجمعِ اغیار — میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا
پھر تمہارے ستم اٹھانے کو — رمز اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

رمز کی ایک دوسری غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجیے ؂

سخنور سے سخنور ہوں، مقابل سے مقابل ہوں
میں ہوں شمشیر سے بجلی مر کامل سے کامل ہوں

میں کس طرح رہوں افسردہ چراغوں میں ستاروں میں
زمیں پر زینتِ محفل، فلک پر ماہِ کامل ہوں

ہمیشہ ایک سا عالم نہیں رہتا زمانہ کا
میں اپنی صورت و تصویر میں کیونکر مقابل ہوں

در دلدار تک جا تو سہی ڈرتا ہے کیوں قاصد
تجھے روکے اگر دربان تو کہہ بھیجو کر سائل ہوں

روشن دہلوی

دہلی کے قدیم شعراء میں مرزا جہاں اشرف روشن دہلوی کے علاوہ ایک دوسرے شاعر شیام لال روشن دہلوی بھی گزرے ہیں۔ یہ ۱۹۰۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۵۷ء میں سورگباش ہو گئے یہ محلہ پیپل مہادیو، حوض قاضی میں سکونت پذیر تھے تعلیم گھریلو بہت معمولی تھی تاہم فطری موزونیت، شوق اور مشق نے ایک اچھے مزاحیہ شاعر کے زمرہ میں داخل کر دیا تھا۔ یہ پہلے جناب برق دہلوی سے تلمذ رکھتے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں جب احسن صاحب مستقل طور پر دہلی میں قیام پذیر ہو گئے تو روشن ان سے وابستہ ہو گئے۔ دونوں اساتذہ کے فیض نے روشن کے کلام میں پختگی پیدا کر دی تھی نہایت پرگو اور زود گو شاعر تھے۔ دہلی میں منعقد ہونے والے ہر مشاعرہ میں ان کے دو تین اشعار بہترین قرار دیئے جاتے تھے جنہیں لوگ عرصہ تک گنگناتے پھرتے تھے۔

نمونہ کلام حاضر ہے۔

قطعہ

کچھ دنوں مجھ پر بھی ایک میڈم رہی تھیں مہرباں
میں یہ سمجھا ان کو بندہ پروری کا ذوق ہے

جب مجھے دھتکار کر بلوا لیا اک اور کو
تب میں سمجھا ان کو کتے پالنے کا شوق ہے

غزل

گھر بیچ کے بھی جیب میں جب کچھ نہ رہا ہے
میخانہ سے مسجد کی طرف رند چلا ہے

بھونپو جو کمیٹی کا سنا بول پڑا قیس
شاید سگِ لیلیٰ تو نہیں چیخ رہا ہے

معشوق کے احسان بھی عاشق پہ بہت ہیں
اب تک کے جو تو لے گئے دو من کا دھڑا ہے

کیوں دخل پولیس کا ہے محبت کی دوکان میں
یہ جبر یہ سودا نہیں راضی برضا ہے

تھا پہلے زری میں عشق بھی ٹٹ پٹ کبھی لیکن
اب تخت سے مرتبہ محبت کا بڑا ہے

ناصح کو نہ چھوڑا ہے پہ اس طرح سے پیٹو
جانے بھی دو، بیہودہ ہے، احمق ہے، گدھا ہے

منہ ٹیڑھا کئے رہتے ہیں ہر روز وہ ہم سے
یہ جوشِ جوانی ہے کہ تقوے کی ہوا ہے

ہے نیم شب اور بیٹھے ہیں پرچہ لئے روشن
کچھ شاعری کا خبط بھی دنیا سے جدا ہے

رسوا دہلوی

آفتاب رائے نام، رسوا تخلص تھا۔ دلی میں جوہریوں کے خاندان میں پیدا ہوا۔ مگر محمد شاہ کے عہد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ معمولی لیاقت کا آدمی تھا اور بادشاہ کے توپ خانہ میں ملازمت کرتا تھا کسی کے عشق میں مبتلا ہو کر ملازمت سے استعفیٰ دے کر کوچہ و بازار میں پھرا کرتا اور یہ شعر ورد زبان ہوتا ہے

رسوا ہوا، خراب ہوا، دربدر ہوا
اس عاشقی کے ٹیکنے میں جس کا گزر ہوا

شراب حد سے زیادہ پیتا تھا، ۱۷۷۰ء میں دلی میں انتقال ہوا۔ مرتے وقت ہم مشربوں کو وصیت کی کہ مجھے مرنے کے بعد شراب سے غسل دینا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اسے شاعری سے بعید لگاؤ تھا۔ اس فن میں کسی استاد سے شرف تلمذ حاصل نہیں کیا۔ جو کچھ دل میں آتا اسے موزوں کر کے دوستوں کو سناتا اور ان سے داد تحسین حاصل کرتا تھا۔

رسوا ایک مرتبہ صوبہ سندھ بھی آیا تھا۔ یہاں کے اس وقت کے نامور شعراء ملا محمد باقر، قاضی عبدالقادر اور شیخ محمد کریم کے ساتھ کئی بزم سخنوراں میں شرکت کی۔ انہیں اپنا کلام سنایا اور خوب داد تحسین وصول کیں۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

رسوا اگر نہ کرتا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

کوئی جا نہیں زمین پہ کہ اشکوں سے نم نہیں
رسوا بھی اس زمانہ میں مجنوں سے کم نہیں

قفس سے واں گئے ہم اور چمن میں جا نہیں
اڑیں تو پر نہیں رکھتے چلے تو پاؤں نہیں

آرام تو کہاں کہ ٹک اک سو کے چپ رہیں
آنسو بھی نہیں رہے کہ بھلا رو کے چپ رہیں

ایسے ظالم سے محبت کی ہے کیا پاؤں گا
یوں نظر آتا ہے مجھ کو روتے روتے مر جاؤں گا

ایامِ جوانی ہو، نشہ ہو، سرِ جُو ہو
یہ سب ہو جاناں مری آغوش میں تو ہو

ہے زندگی کا لطف تب اے خضرِ خوش اوقات
جب ہاتھ میں ساغر ہو، صراحی ہو، سبو ہو

مست ہو کر گر پڑے ہیں ہر طرف دیوار و در
ابرِ رحمت ہے برستا یا برستی ہے شراب

کہتے ہیں شیخ یوں کر تو اسلام کر قبول
اور برہمن یوں کہتے بتوں کے تئیں نہ بھول

رہتا ہوں روز و شب میں اسی فکر میں ملول
کس کا کہا میں مانوں اور کس کا کروں عدول

از کوئے تو بہ کعبہ روم یا بہ بتکدہ
اے پیرِ راہ بگو کہ طریقِ ثواب چیست!

جس کا تجھ سا حبیب ہووے گا
اس کا عالم رقیب ہووے گا

دیتے ہیں عقد جس میں عاشق عروسِ جاں
آتا نہیں جو آپ تو تلوار بھیج دے

دل کا گھبرانا کہوں یا کہ نفس کی تنگی
دیکھیے کیا کرے صیاد قفس کی تنگی

maablib.org

رنگین دہلوی

نواب سعادت یار خاں نام، رنگین تخلص تھا۔ طہماسپ بیگ خاں تورانی کے صاحبزادہ تھے، طہماسپ خاں ۱۷۷۹ء (میں)، نادر شاہ کی فوج کے ساتھ ہندوستان آئے۔ رنگین سنہ ۱۱۶۹ھ بمطابق ۱۷۵۶ء سرہند میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۵ء میں اسی (۸۰) سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہ اچھے شہسوار اور فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے، اگرچہ معمولی لیاقت کے آدمی تھے لیکن شعر گوئی میں ملکہ راسخہ حاصل تھا۔ بچپن دلّی میں بڑے عیش و آرام سے گذرا جس کی جھلک رنگین کے مزاج اور افتاد طبع میں پائی جاتی تھی۔ انہوں نے پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا، انہیں اس فن میں شاہ حاتم سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حاتم کے بعد امان نثار کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ آخر میں مصحفی کے شاگرد ہو گئے۔ (جرمن مستشرق بلوم ہارٹ ایم اے کی بھی یہی تحقیق ہے کہ وہ مصحفی کے شاگرد تھے) پہلا دیوان ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء میں مکمل ہوا۔ اس وقت رنگین سپاہی پیشہ تھے۔ اس کے بعد ملازمت ترک کر کے ریاست بھرت پور چلے گئے۔ وہاں سے ۱۲۰۴ھ میں لکھنؤ پہنچے اور سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔

رنگین بچپن ہی سے آزاد منش، عیش پرست اور لاابالی طبیعت کے انسان تھے۔ تنخواہ اور انعام و اکرام سے بخوبی شاہانہ خرچ چلتا تھا مگر پیر میں چکر تھا۔ چند سال مرشد آباد و ڈھاکہ وغیرہ میں گزار کر گوالیار کے خاندھو جی سندھیا کے ملازم ہو گئے، نواب کا خطاب اور فوجی پلٹن کی کمان ان کے سپرد ہوئی۔ یہاں سے دل اُچاٹ ہونے کے بعد کلکتہ اور پھر یاترہ پہنچے۔ یہیں موصوف نے اپنا کلام مرتب کیا۔ قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ موصوف کی

تصانیف میں مثنوی دلپذیر و ایجادِ رنگین، مظہر العجائب کافی مشہور ہیں۔ رنگین کے چار دیوان "دیوان ریختہ" "دیوان بیختہ" "دیوان آمیختہ" "دیوان انگیختہ" ریاست رامپور کی لائبریری میں موجود ہیں۔ ان سب کے مجموعہ کو "نورتن" کہا جاتا ہے۔

رنگین کی شاعری وسط اٹھارویں صدی کی بہترین مثال ہے اس دور میں سادہ بیان کو فکر سخن کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ ان کا کلام سیدھا سادا ہے یہاں تک کہ تشبیہوں، استعاروں، اضافت اور فارسی ترکیبیں بھی شاید ہی پائی جاتی ہیں۔ کلام میں جو کچھ لطف ہے۔ وہ صفائی بیان، محاورہ اور شیریں زبان کا ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے ؎

کیا کرتے ہو ناصح تم نصیحت رات دن مجھ کو — اسے بھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

جان دی راہ محبت میں الٰہی صد شکر — بات جو ہم نے کہی تھی سو نباہی صد شکر

مجھ کو روتا دیکھ کر بولی وہ دل آزاری نہ کر — تیرے صدقے ہو کے مر جاؤں میں جی بھاری نہ کر

وہ نہ آئے تو، تو ہی چل رنگین — اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

جو تیرے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی — کیوں جی! کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

یارب شب جدائی تو ہرگز نہ ہو نصیب — بندی کو یوں تو چاہے تو کولھو میں پیل دے

قیامت پر رہا موقوف پھر تو دیکھنا اس کا — اگر اک دم کے دم آتے ہیں وہ تاخیر کرتا ہے

زہر کر دیتی ہے وہ کھانے کو لڑ کر مجھے روز — آج سے میں ساتھ اسکے کھانا کھاؤں مُردار

کیا گئی گزری ہوں میں ایسی کہ جاؤں دور بگڑ — اور منا کر ساتھ اپنے لاؤں مُردار

اس نے ہمسائے میں آ کر گھیر لیا تو کیا ہوا — اب اسے آواز میں اپنی سناؤں مُردار

مارا پتھر پہ سر اور سینے پہ پتھر مارا — پر ترا دل نہ ملا ہم نے بہت سر مارا

دل کو رنگین کے کیا یوں تیری الفت نے دبوچ — باز نے جوں کوئی رنگین کبوتر مارا

رونق دہلوی

منشی پیارے لال نام اور رونق تخلص تھا۔ یہ منشی جے نرائن کے بڑے لڑکے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور مئی ۱۹۳۲ء میں دہلی ہی میں فوت ہو گئے۔ محلہ روشن پورہ، نئی سڑک میں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جو ہوٹل کم اور مشاعرہ گاہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ صبح سے شام تک ہوٹل ہر قوم و طبقے کے علم دوست حضرات اور شعراء سے بھرا رہتا جہاں لوگ ایک دوسرے کا کلام سنتے، سناتے اور داد تحسین دیتے نظر آتے تھے۔ رونق دہلی کے پرگو اور زود گو شاعر تھے۔ ان کا استاد داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتا تھا۔ آپ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ موصوف نے ۱۹۱۲ء میں منشی چھنڈی پرشاد شیدا کے تعاون سے رسالہ "کمال" جاری کیا تھا جس میں شعراء کا منتخب کلام شائع ہوتا تھا۔ کنور بدری کرشن فروغ اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی حامیان رسالہ تھے۔

رونق بنیادی طور پر غزل گو تھے لیکن نظم بھی خوب کہتے تھے، مشاعروں میں تحت اللفظ پڑھتے تھے، اپنی بلند آواز اور پرشور طرز بیاں کی وجہ سے مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔

ایک نظم میں عہد ماضی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں ؎

صد نازشِ زمانہ تھے، باوقار تھے ——— سرچشمۂ علوم تھے ذی اقتدار تھے
گل کی شگفتگی تھے چمن کی بہار تھے ——— باغ جہاں میں رحمتِ پروردگار تھے

چھائی ہوئی فلک پہ تھیں اقبال مندیاں
دھرتی نہ تھیں زمیں پہ قدم سربلندیاں

عہد حاضر کو یوں مخاطب کرتے ہیں ؎

اب نہ وہ دبدبہ حسن، نہ شان و شوکت ——— اب نہ وہ رنگ، نہ وہ رعب، نہ ویسی صورت

اب نہ وہ دوست عطرِ ثروت، نہ وہ جاہ و حشمت　　اب نہ وہ زور نہ وہ جوش، نہ تاب و طاقت

اوج سے بخت نے کچھ ایسی دکھائی پستی

نظر آنے لگی اب خاک ہماری ہستی

ایک نظم میں عہدِ ماضی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں۔

قائم بغیر روح کے کوئی بدن نہیں　　وہ جسم کیا ہے جس کا کوئی پیرہن نہیں

خالی گلوں سے کوئی جہاں میں چمن نہیں　　ہے کون جس میں جذبۂ حب وطن نہیں

دور از وطن بھی یادِ وطن دم کے ساتھ ہے

ہو جائے دم قدم سے جدا، کوئی بات ہے

رونق بہت بلند ہمت اور باوقار شخص تھے۔ خراب سے خراب حالات میں بھی ہمیشہ پُر اُمید رہتے تھے، لہٰذا کہتے ہیں ؎

محبت والوں کی قسم، گردشِ دوراں کی قسم

نشترِ غم کی قسم، سوزشِ پنہاں کی قسم

تاب و طاقت کی قسم، ہمتِ مرداں کی قسم

دخل جس کام میں دینا اسے پورا کرنا

کام مردوں کا نہیں، کام ادھورا کرنا

تلوک چند محروم ۱۹۱۶ء میں دلی آئے تو دیگر ممتاز شعراء کے علاوہ رونق دہلوی سے بھی ملے اور فرمایا ؎

ملے کیفی و رونق سے، سنے اشعار بھی ان کے　　ابھی پردہ میں گوش و چشم کے ہے جو سنا، دیکھا

مگر جب دوبارہ ۱۹۱۹ء میں دلی آئے تو رونق سورگباش ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس

رونق وسیع المشرب تھے۔ انھوں نے اپنے کلام میں رام اور کرشن کے پہلو بہ پہلو ذات محمدؐ اور شان نبوت کو اہم جگہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول تھے۔ ان کے سورگباش ہونے کے بعد ان کی ارتھی میں مسلمان بھی شریک تھے۔ رونق کی وفات پر منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

شعر افسردہ، طپاں برق، منور غمگین | غوث رنجیدہ، مدن واقف الم، زار حزیں
چشم نم ساحر و مجبور سے بھی ہیں اہلِ یقین | گفتنی حالِ دلِ کیفی و شیدا کا نہیں

کیوں عزا دار نہ ہوں بیخود و سائل دونوں
دل سے تھے رونقؔ مرحوم کے قائل دونوں

رونق کی ایک غزل ملاحظہ کیجئے ؎

کیا ضبط ہو اس غم سے تڑپ اور سوا ہے | اِک دِل بھی سکوں میں ہے تو وہ درد بھرا ہے
مر جائیں نہ کیوں سیکڑوں اے نازنین تجھ پر | یہ ناز ادا بھی تیرا انداز قضا ہے
میدانِ محبت میں قدم بھی نہیں اُٹھتے | اِک ہستی ناچیز ہے اور راہِ وفا ہے
اس کشمکش ضبط سے مر جائیں تو اچھا | جینے کا مزا ہے نہ تڑپنے کا مزا ہے
اللہ رے ارمانِ محبت کی کشاکش | آغاز ہی اچھا ہے نہ انجام بُرا ہے

یوں جان دیئے دیتے ہیں ہم حسن پہ رونقؔ
مرنا بھی رہِ عشق میں اِک رسم وفا ہے

رونق دِلّی کی باغ و بہار شخصیت تھی۔ دِلّی کے علاوہ بیرونجات کے ہر حلقہ ادب کے لوگ ان سے بیحد پیار کرتے تھے، کثرتِ مے نوشی کی وجہ سے ۱۹۴۴ء میں سورگباش ہو گئے۔ آپ نے دو دیوان " رونقِ سخن اور " کلامِ رونقؔ یادگار چھوڑے ہیں جواب نایاب ہیں۔ مختصر انتخاب پیش کر رہا ہوں ؎

وہ نوا ہے درد ہوں اضطراب غم نہ چھیڑ مجھے | شکست ساز کا اپنے خموش نغمہ ہوں

کس شوق سے لیتی ہیں تمہیں مول نگاہیں | دیکھے تو کوئی چشم خریدار کے انداز

وقت کے ماحول سے متاثر ہو کر انھوں نے فرمایا ؎

رہتے تھے کبھی مہر و وفا دلّی میں — تھا جلوہ برق رُو نما دلّی میں
کیفی کے بغیر یہ فضا ہے بے کیف — رونق جو نہیں تو کیا سا دلّی میں

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، رونق دہلوی کے متعلق اپنی نظم شعراء دلی میں فرماتے ہیں ؎

زینت بزم ادب رونق شیدائے سخن
بادۂ شعر سے کس وقت یہ مخمور نہیں

رضاؔ سلطانپوری

شاہ حسن رضا وارثی نام اور رضاؔ سلطانپوری تخلص تھا۔ رضاؔ ۱۸۵۹ء میں سلطان پور (اتر پردیش) میں پیدا ہوا۔ اس کے والد حاجی وارث علی شاہ رح کے مریدوں میں تھے۔ وہ رضاؔ کو کمسنی ہی میں اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں لیگئے۔ حاجی صاحب نے اسے مریدین میں شامل کر لیا۔ رضاؔ کچھ عرصہ عبادت کیلئے ریاضت میں مشغول رہا روحانی پیشوا کے فیوض و برکات سے مستفید ہوکر کلکتہ میں پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہوگیا۔ یہاں اس کے جذب و کیف کو دیکھ کر سارا محکمہ اس کا عقیدت مند ہوگیا۔ افسرانِ اعلیٰ نے اسے وردی پہننے اور ڈیوٹی پر حاضر ہونے سے بری الزمہ کر دیا تھا۔ وہ مدت ملازمت پوری کر کے سبکدوش ہوگئے مگر قیام کلکتہ ہی میں رہا۔ رضاؔ کے عقیدت مند سارے ہندوستان میں بالخصوص بہار میں پھیلے ہوئے تھے۔ رضاؔ کو پڑھنے لکھنے کا موقع نہیں ملا تاہم وہ درسگاہ سخن میں ضرور شامل ہوگئے۔ خداداد ذہانت اور موزونیت سے اپنے جذب و تاثر میں ڈوبے ہوئے جذبات کو شعری پیکر میں ڈھالنے لگے وہ اُردو کے علاوہ فارسی، ہندی اور پوربی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ کلام کا انتخاب "فرمودات رضاؔ" کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوکر شرف قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ رضاؔ صاحب چند روز بیمار رہے اور بالآخر ۱۷، اپریل ۱۹۵۴ء کو ۹۵ سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جاملے معتقدین نے رائے چرن پال روڈ کلکتہ میں ان کا شاندار مقبرہ تعمیر کروایا ہے۔

نمونۂ کلام حاضر ہے :-

نعت

اللہ رے جمال رخ نیکوئے محمدؐ — اے صلِ علیٰ نرگس جادوئے محمدؐ
چلتی ہوئی شمشیر ہے ابروئے محمدؐ — والشمس ہے گر آئینہ روئے محمد
واللیل صفت کیوں نہ ہو گیسوئے محمدؐ

آنکھوں کے قریں ہو رخ پرنور نقشہ — تا حشر میں دیکھا کروں محبوب کا جلوہ
جنت کی تمنا ہے نہ کچھ حور کی پروا — بس اتنی گزارش ہے فقط اے میرے اللہ
تربت مری بن جائے سرکوئے محمدؐ

اللہ ہے شاہد کہ گوارا نہیں فرقت — ہو جائے کسی طرح سے روضہ کی زیارت
فرقت جو نبی کی ہے تو کیا کم ہے مصیبت — کیا خاک رضا مجھ کو ہو اس دہر میں راحت
دل اپنا کھنچا جائے ہے جب سوئے محمدؐ

غزل کے چند اشعار سے

تو ایسا ہے کہ ہر شے میں نظر آتا ہے — چشم باطن سے اگر دیکھنے والا دیکھے
کور باطن سے یہ کہہ دو کہ مٹا کر ہستی — قطرے قطرے میں نظر آئے گا دریا دیکھے
ہم اسی طرح رضا دیکھ رہے ہیں اس کو — جس طرح پیاس کا مارا کوئی دریا دیکھے
میں وہ میکش ہوں اے زاہد کہ جس کی پیشوائی کو — طواف رند کرنے آج خود میخانہ آتا ہے
سر میں سودا ہے اگر رونق بازار بھی ہے — تم جو یوسف ہو مری جاں تو خریدار بھی ہے
کوئی جاہ و دولت کوئی ملک بیچے — میں دربار مولا میں سر بیچتا ہوں
رضا اور باقی ہے کیا پاس میرے — جو لے کوئی تو چشم تر بیچتا ہوں
غیر کب دل کا مدعا جانے — میرا مقصد مرا خدا جانے

در حقیقت اسے نہیں ہے فنا
اپنی ہستی کو جو بقا جانے

جس میں آتا ہے بت کافر تری پوجا کروں
آئینہ تجھ کو بناؤں اور میں دیکھا کروں

پوچھتے کیا ہو رضا کون ہے مجھ سے صاحب
وہ تو صوفی بھی ہے زاہد بھی ہے میخوار بھی ہے

غزل

غمِ گل ہے ہر اک پھول ہے رشکِ جنت
ایسے عالم میں تم آؤ تو غزل ہو جائے

مجھ سے وہ بدگماں سہی اے دل پائمالِ غم
ہونٹوں پہ ہوگا میرا نام آج نہیں تو کل سہی

غمِ حیات کہاں تک خوشی کی بات کرو
یہ میکدہ ہے یہاں زندگی کی بات کرو

کہہ رہا ہوں در و دیوار سے روداد وفا
کوئی دیکھے تو سہی میرے جنوں کا عالم

رزمی بتاؤ لب پہ ہے کیوں نالۂ فغاں
پوچھا یہ آج اس نے بڑی سادگی کے ساتھ

maablib.org

رزمی شاہجہانپوری

رحمت شاہ خان نام، رزمی عابدی شاہجہانپوری تخلص تھا۔ ۱۹۳۲ء میں شاہجہانپور میں پیدا ہوا۔ والد نادر شاہ خاں ریلوے پولیس میں ملازم تھے جو متعدد مقامات بریلی، بنارس وغیرہ میں تعینات رہے، رزمی کی تعلیم گھریلو طور پر ہوئی، پھر جہاں والد تعینات ہوئے وہاں کے اساتذہ سے پڑھ کر مڈل سے ہائی اسکول تک پہنچا۔ بارہ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا اور رزمی تعلیم کی تکمیل نہ کر سکا۔ تاہم ذاتی کوشش اور شوق کی بدولت اہلِ علم کی صحبتوں سے فیض اٹھایا اور علمی استعداد میں اضافہ کیا۔ معاش کے لئے والد کی جگہ ریلوے پولیس میں ملازمت کر لی اور متعدد اضلاع میں بحیثیت ہیڈ کانسٹیبل خدمات انجام دیتا رہا۔

رزمی کو شعر و سخن سے دلچسپی بچپن سے تھی۔ علمی و ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں تھا۔ مشاعروں کا انعقاد اور مقامی شعراء و ادباؑ سے نیازمندانہ تعلقات رکھتا تھا۔ باقاعدہ شاعری کی ابتداء ۱۹۵۰ء میں ہوئی جب وہ شاہجہانپور کے معروف شاعر عابد مینائی جانشین حضرت دل شاہجہانپوری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ رزمی خوش اخلاق اور خوش کلام تھا۔ وہ کلام ترنم سے پڑھتا تھا اور مشاعروں کی محفلوں پر چھا جاتا تھا۔

رزمی نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل اُس کی محبوب صنفِ سخن رہی۔ مجموعۂ کلام "شاہدِ فطرت" ۱۹۷۶ء میں آگرہ میں چھپ کر اہلِ فن سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔

رزمی بسلسلۂ ملازمت ہردوئی میں مقیم تھا۔ حسن اخلاق و خوش کلامی کی

کی وجہ سے ہر دلعزی کی محبوب شخصیت بن گیا تھا۔ افسوس یکم جنوری ۱۹۸۱ء کو وہ اپنے چاہنے والوں کو داغِ مفارقت دے گیا۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

حمد

ایک دریا رواں ہے رحمت کا — ہے یہ عالم تیری عنایت کا
تو خدا ہے میں تیرا بندہ ہوں — ہے شرف بندگی کی نسبت کا
تھک گئے اہلِ ہوش و اہلِ خرد — کوئی سمجھا نہ رازِ قدرت کا
دَرِ کعبہ ہے اور میری جبیں — گو سلیقہ نہیں ہے طاعت کا
میں گنہگار ہی سہی رمزی — مجھ کو بھی آسرا ہے رحمت کا

نعت

جدھر دیکھتا ہوں تمہیں جلوہ گر ہو — خدا کی قسم آبروئے بشر ہو
شگفتہ تم ہی سے ہے باغِ دو عالم — حیاتِ دل و جاں ہو خلدِ نظر ہو
ملا اس کو سب کچھ جسے مل گئے تم — کہ فخرِ ملائک ہو خیر البشر ہو
جہاں گامزن تھے رسولِ مکرم — بہشتِ نظر کیوں نہ وہ رہگزر ہو

یہ ناکامیاں یہ مصائب کہاں تک
کبھی اپنے رمزی پہ بھی تو نظر ہو

قطعہ

مجبور کی عظمت کوئی مجھ سے پوچھے — کونین کو مجبور بدل دیتا ہے
آجاتا ہے جب ضد پہ کوئی بندہ خاص — اللہ بھی دستور بدل دیتا ہے

زیبا شاہجہاں آبادی

عبدالرحیم نام اور زیبا تخلص تھا۔ والد خواجہ محمد شفیع کشمیر کے رہنے والے تھے اور پشمینہ کی تجارت کرتے تھے۔ زیبا قدیم شاہجہاں آباد (دہلی) میں پیدا ہوا اور ساری زندگی اسی کے گلی کوچوں میں بسر کر دی۔ باوجود کم علمی کے طبیع رسا و ذہن ذکا رکھتا تھا۔ فن شعر گوئی میں مصحفی سے شرف تلمذ تھا۔ سعی محنت اور استاد کی اصلاح سے اس قابل ہو گیا کہ بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کرتا اور داد تحسین حاصل کرتا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے ؎

؎ پھر آپ نے غیروں سے ملاقات نکالی
اچھا یہ نئی چھیڑ مرے ساتھ نکالی

؎ پہلے تو ہم کو پیارا صورت دکھا دکھا کر
آخر کو لے گئے دل مرا لبھا لبھا کر

؎ دے بوسہ گر اس طفل پریزاد کے منہ پر
تو رنگ کچھ آوے گا دل ناشاد کے منہ پر

؎ کچھ کہا کے مر رہیں گے ہم تو یوں پیارے
راتوں کو تم پھرو گے بستی لگا لگا کر

زرؔ لاہوری

شیخ باقی خلف شیخ سعد اللہ نام اور زرؔ تخلص تھا۔ پیشہ سادہ کاری تھا۔ لاہور میں پیدا ہوئے لیکن بسلسلہ معاش آگرہ میں رہتے تھے۔ زرؔ ابھی آٹھ نو برس کے ہوئے تھے کہ باپ نے خاندانی پیشہ سادہ کاری میں لگا دیا۔ نتیجتاً زرؔ کو آبائی پیشے میں تو اچھی خاصی مہارت ہو گئی مگر لکھنے پڑھنے سے قطعی محروم رہا۔ قرآن مجید کی تعلیم کی وجہ سے البتہ اتنی سد بدھ ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ موٹی موٹی عبارت اٹکوں سے پڑھ لیتا تھا یا اپنا نام لکھ لیتا تھا۔ اس زمانہ میں ہر طرف شاعری کا چرچہ تھا۔ زرؔ کو بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا تھا ان دنوں آگرہ میں حاتم علی مہرؔ کی شہرت عام تھی۔ اصلاح کے لئے زرؔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے شرفِ تلمذ حاصل کر لیا۔ زرؔ کے اشعار میں تخیل اور بندش اچھی ہوتی تھی استاد کی اصلاح نے مزید خوبصورتی اور دلکشی پیدا کر دی۔ یہ مہرؔ صاحب کے ہمراہ مقامی مشاعروں میں شریک ہوتے اور داد تحسین وصول کرتے تھے۔

کلام کا نمونہ درج ذیل ہے

کون سی صورت ہے ملنے کی بتوں سے یہ بتا
وہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

دل میں جگر میں سینے میں یکساں ہے درد آج
اے چارہ گر بتاؤں کدھر کم کدھر بہت

پھنسی ہے مری جانِ حزیں زلفوں کے پھندے میں
اسیرانِ خمِ کاکل گرفتارِ بلا ٹھہرے

زآر لکھنوی

نام میر حسن عرف میر کلو پسر میر تقی میرؔ اور زآر تخلص تھا۔

بہ مقتضائے موروثی موزوں سخن تھے۔ اگرچہ بہت معمولی پڑھے لکھے تھے تاہم طبیعت کی صفائی اور فکر کی رسائی سے شعر موزوں کرتے تھے۔ جو کچھ بھی موزوں کرتے۔ امام بخش ناسخ کی اصلاح سے مزین کر لیا کرتے تھے۔

زآر کی دو غزلیں پیش کی جاتی ہیں۔

وصل منظور ہے فرقت سے کنارا کب ہے — وہ بھی ادنیٰ ہے مجھے یہ بھی مجھے انسب ہے

میرے مرنے سے جو تو خوش ہے تو میں بھی راضی — جو کہ مطلب ہے ترا یاں بھی وہی مطلب ہے

صحبت اہل خرد جبر ہے نادانوں کو — طفل کو خانہ زنداں سے فزوں مکتب ہے

آتش غم سے میں دن رات جلا کرتا ہوں — داغِ فرقت مرے طالع کا مگر کوکب ہے

زلف کے سوز میں روتا ہوں میں جو ابر بہار — روز روشن مرا ساون کی اندھیری شب ہے

گرچہ درویش ہوں پر زر دیا سلطان سے — دامن حرص رہا دور کفِ احسان سے

تیری باتیں جو کبھی آئینہ رو یاد آئیں — مدتوں صورت تصویر رہے حیران سے

اب گریے سے نہ سوزِ دل بیتاب مٹا — آتش برق کبھی بجھتی نہیں باراں سے

رنگ سو بجلے یہاں پر نہیں ممکن اے زآر
وصل کا زور مبدل ہو شب ہجراں سے

سچل سرمست

نام عبدالوہاب عرف سچے ڈنو اور سچل تخلص تھا۔ ۱۷۳۹ء بمقام درازا ضلع خیر پور (سندھ) میں پیدا ہوئے اور ۱۴ رمضان المبارک ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۷ء میں نوے سال کی عمر میں خالقِ حقیقی سے جاملے درازا ہی میں دفن ہوئے جہاں آپ کا مزار زیارتِ خاص وعام ہے۔ سچل کے جدِ امجد فاتح سندھ محمد بن قاسم کے ہمراہ ہندوستان آئے اور سیوہن میں قیام پذیر ہوگئے

سچل ابھی چھ برس کے ہی تھے کہ ان کے والد صلاح الدین فاروقی کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے چچا خواجہ عبدالحق کی زیرِ سرپرستی آگئے۔ ابتدائی تعلیم ہالا کے مشہور عالمِ دین حافظ عبداللہ قریشی صدیقی سے حاصل کی! انہیں سے شرفِ بیعت حاصل کرکے تصوّف ومعرفت کے رموز سے آگاہ ہوئے۔ بعدازاں اپنے اشعار میں نفیٔ اثبات فنا وبقا، حال وقال، ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے اسرارِ رموز کو اجاگر کرتے رہے۔ ساتھ ہی حق وحقانیت کا فرض بھی ادا کرتے رہے۔

سچل نے برِ صغیر کی تمام معروف زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اسی وجہ سے آپکو شاعرِ ہفت زبان کہا جاتا ہے۔ آپ فارسی زبان میں آشکارا اور خدائی تخلص کرتے تھے۔ فارسی مثنویوں پر مشتمل دیوان دیوانِ آشکار کے نام سے طبع ہوچکا ہے۔ سندھی و سرائیکی زبانوں میں بہت بڑا ذخیرہ نغموں وکافیوں پر مشتمل ہے سچل نے اردو زبان کسی سے نہیں سیکھی، اردو شاعری

میں بھی کسی سے تلمذ حاصل نہیں کیا. حالتِ استغراق میں سندھی اور سرائیکی کے علاوہ اردو زبان میں بھی اشعار کہتے تھے۔ جنہیں ان کے معتقدین لکھ لیا کرتے تھے. اردو شاعری میں سچل تخلص کرتے تھے. اردو کلام کی زبان نہایت سادہ ہے. انتخاب پیشِ خدمت ہے.

؎ میری آنکھوں نے اے دلبر عجب اسرار دیکھا تھا
بسانِ ابر اس خورشید کا انوار دیکھا تھا
جلایا طورِ سینا کو تھا جس نورِ تجلی نے
ترے کوچہ میں اس انوار کا اظہار دیکھا تھا
مرا تو کام تھا اس ہادی و رہبر کی صورت سے
اسی صورت کا میں نے ہر جگہ دیدار دیکھا تھا
جو آیا تھا وہاں سے ایک بار اس بزمِ زنداں میں
نہ اس مدہوش کو ہم نے کبھی ہوشیار دیکھا تھا

؎ تیرے ہی ناز سے آنکھوں کے میں غلام ہوا
ترا ہی عشق مرا پیشوا امام ہوا
ترا ہی عشق مرا پیشوا امام ہوا
کروں میں کس کو بھلا اپنے حال سے آگاہ
ترے ہی درد سے قصّہ مرا تمام ہوا

؎ دلبر کے در پہ میں تو دیوانہ ہو رہا ہوں
یارو میں دو جہاں سے بیگانہ ہو رہا ہوں
یہ عقل و فہم اس کے دیدار نے اڑایا
زلفوں کے پیچ و خم میں مستانہ ہو رہا ہوں

سردار لکھنوی

سردار بیگم نام اور سردار ہی تخلص تھا۔ یہ لکھنؤ کی رہنے والی تھی مگر بالکل ناخواندہ۔ محض شوق اور موزونیٔ طبع کی بدولت شعر موزوں کرتی تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء میں بیوہ ہو کر لکھنؤ سے کانپور اور پھر قنوج چلی گئی۔ بالآخر اٹاوہ میں مستقل سکونت پذیر ہو گئی۔ غدر کے ابتلا اور مصائب سے دل برداشتہ ہو کر اپنی بیٹی کاظمی بیگم کو ناچ گانے کی تعلیم دلوا کر باقاعدہ طوائف بن گئی تھی۔ اس بے راہ روی میں بھی شرافت اور شوقِ سخن باقی رہا جو کچھ موزوں کرتی ناخواندگی کی وجہ سے کسی دوسرے سے لکھوا کر اپنے پاس رکھ لیتی تھی۔

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

غزل

وہ تو ہمارا لے گئے بیٹھے بٹھائے دل
ہرگز نہ کوئی آپ سے اپنا پھنسائے دل
آتی نہیں ہے نیند شبِ ہجر میں مجھے
ہے کوئی ایسا اس سے مرا پھیر لائے دل
بے جرم مجھکو یار نے مارا ہے دوستو
اب دل ہی دل میں کرتی ہوں فریاد ہائے دل
سردار روزِ محشر اٹھ کر کہے گی یہ
عاشق کہاں سے سنگ کا اپنا بنائے دل

سردار کی ایک غزل کے چند اشعار:۔

لگایا گل سے جو دل کو تو نے سمجھ لے دل میں یہ اپنے بلبل
ہیں چند روز بہار کے دن یہ گل تو روزِ خزاں نہ ہوگا
بہت کتابیں پڑھی ہیں تم نے یہ مانا ہم نے بھی شیخ صاحب
چھپاؤ ہم سے نہ حالِ دل کو نہاں اب عشقِ بتاں نہ ہوگا

سکندر دہلوی

خلیفہ محمد علی نام اور سکندر تخلص تھا۔ دلی کا رہنے والا تھا۔ اگرچہ علم سے قطعی نابلد تھا مگر بلا کا ذہین اور زود گو تھا۔ ناجی سے مشورۂ سخن کرتا تھا۔ شاعری کے ساتھ لطیفہ گوئی و قصہ خوانی میں کمال رکھتا تھا نہ صرف مے نوشی کا شائق تھا بلکہ شراب کشیدگی کے فن میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ بڑا زندہ دل و آزاد منش شخص تھا۔

اصل میں یہ مرثیہ گو شاعر تھا اور اس کو نجاتِ آخرت کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس نے اردو کے علاوہ پنجابی، پوربی اور مارواڑی زبانوں میں، مرثیے منظوم کئے ہیں۔ جو عزاداری کی محفلوں میں اب بھی پڑھے جاتے ہیں۔

دلی غدر کے بعد جب اہلِ کمال سے خالی ہونا شروع ہوئی تو سکندر بھی ترک وطن کر کے لکھنؤ چلا گیا اور مرزا سلیمان شکوہ کے دامن و دولت سے وابستہ ہو گیا۔ کلام درج ذیل ہے:

کیا کمان ابرو نے اک تیر نظارا مارا
جسکے لگتے ہی جگر ہو گیا پارا پارا

کیا تجھے اور نہ تھا ہستی کے جنگل میں شکار
مرغ دل تو نے جو صیاد ہمارا مارا
رات تنہائی میں آیا تھا تصور تیرا
ذکر تیرا ہی کیا، آہ کا نعرہ مارا
عشق بازی کے لئے ہم نے بچھائی جو بساط
پانسہ گرتے ہی گیا رنگ ہمارا مارا

سرسبز

مرزا زین العابدین خاں عرف مرزا مینڈو نام اور سرسبز تخلص تھا۔ یہ نواب سالار جنگ مرحوم کے صاحبزادے تھے مگر علم سے قطعی بے بہرہ نہایت خوش خلق، ذہین اور موزوں سخن تھے اور مصحفی کے خرمنِ فیض سے بہرہ ور تھے۔ استاد کی توجہ اور محنت سے زبان پر عبور حاصل ہو گیا۔ ان کے اشعار سے قطعی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ ایک ناخواندہ کا کلام ہے۔

نمونہ یہ ہے ؎

کب خوش آتی ہے مجھے سیر گلستاں تجھ بن نظر آتا ہے چمن خانۂ زنداں تجھ بن

شب انتظار گذری ہمیں انتظار کرتے کبھی دوست دوست کرتے کبھی یار یار کرتے

ترا یار اس جگہ تھا نہ ہوا تو وائے سرسبز اگر اس گھڑی تو ہوتا تجھے ہم دو چار کرتے

میں سرسبز روتا ہوں آتی ہے جب یاد وہ صورت مجھے پیاری پیاری کسی کی

اپنے عاشق کے نہ بالیں پہ آیا صد حیف جان دی اس نے بصد حسرت و حرماں تجھ بن

سلیم کھتولوی

سلیم احمد نام اور سلیم کھتولوی تخلص تھا۔ یہ کھتولی ضلع مظفر نگر (ہندستان) میں ۲۲ اگست ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوا اور ۱۳ نومبر ۱۹۸۹ء کو میرٹھ کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گیا۔ یہ مادر زاد نابینا تھا۔ ماں باپ بہن بھائی حتیٰ کہ بیوی کی بھی آنکھیں بے نور تھیں۔ شاعری سے ابتدا دلی لگاؤ تھا۔ موزوں طبع اور زود گو تھا۔ اپنی پر جوش نظموں سے نوجوانوں کو گرما دیا کرتا تھا۔

علاوہ ازیں ایک پر جوش سماجی و سیاسی کارکن بھی تھا۔ ۱۹۴۰ء میں تحریک آزادی کے سلسلے میں پولیس لاٹھی چارج میں سخت زخمی ہو کر موت کے قریب پہنچ گیا تھا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی بروقت توجہ و مدد سے جلد صحت یاب ہو گیا تھا۔ موزوں طبع ہونے کے علاوہ زود گو اور پر گو بھی تھا۔ جشن آزادی کے سلسلے میں بس فورڈ کلب نئی دہلی میں جو مشاعرہ ہوا تھا۔ اس میں سلیم کھتولوی نے منفرد ترنم و پر جوش آواز میں اپنا کلام سنایا تھا۔ جس سے متاثر ہو کر مشہور فلمی نغمہ نگار و شاعر شکیل بدایونی نے موصوف کو پانچ سو روپے بطور انعام دیئے تھے۔ جہل و ناخواندگی کی وجہ سے اپنا کلام محفوظ نہیں رکھ سکا۔

سخت کوشش سے ایک قطعہ دستیاب ہوا ہے جو نمونے کے طور پر حاضر ہے۔

قطعہ

دو روزہ عمر فانی میں زر و مال و جواہر پہ
جو عالی ظرف ہوتے ہیں وہ اترایا نہیں کرتے
مجھے کم ساتھ لے لو گر کوئی ساتھی نہیں ملتا
اکیلے محفل اغیار میں جایا نہیں کرتے

سرورؔ مدراسی

شاہ عثمان نام اور سرورؔ تخلص تھا۔ یہ محمد پور (ارکاٹ) کا رہنے والا تھا۔ (انوارالدین خان ۱۱۶۳ھ / ۱۷۵۰ء) کے زمانے میں بقید حیات تھا مدراس میں انتقال ہوا۔ ارکاٹ کے محلہ تیلی واڑی میں مزار ہے۔

دراصل سرورؔ مجذوب تھا اور حالتِ جذب میں شعر کہتا تھا معتقدوں نے اس کے اشعار جمع کر کے دیوان مرتب کیا اور مدراس سے شائع کیا ہے۔ نمونۂ کلام حاضر ہے۔

؎ شاخ بلند پہ ثمرِ خام تھا مرا
اس پختگی نے خاک میں مجھ کو ملا دیا

؎ جب میرے رخ پہ خجالت کی سیاہی نظر آئی
خود بخود میرے گناہوں کو گواہی نظر آئی

؎ دور صحبت سے رکھے اس کے خداوند کریم
ہو کہ تنہا جو کرے پھر گلہ تنہائی کا

؎ بوئے وفا کو گل کی طرح اے صبا مری
ٹوٹے کبھی قفس بھی خدا نہ جدا کرے

؎ جان و دل کو عشق نے سرورؔ کے صد پارہ کیا
تو ہے کس امید پر اب اے گریباں الوداع

؎ کس قدر شوقِ شہادت کا مجھے ہے قاتل
لاشِ دل دوش پہ آہوں کے دھری رہی ہے

ساحر مصطفائی

عبدالجلیل ولد عبداللہ جان نام، ساحر مصطفائی تخلص ہے۔ یہ پشاور کے ایک غریب زمیندار گھرانے میں ۱۱ اپریل ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ چھ ماہ کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے ساحر کو پالا پوسا۔ پانچ سال کی عمر میں مدرسہ بٹھائے گئے مگر دوسرے ہی دن مدرسہ سے اٹھا کر نان بائی کے کام پر لگا دیا گیا۔ ساحر تعلیم تو حاصل نہ کر سکے البتہ درسگاہ سخن میں ضرور داخل ہو گئے۔ مادری زبان ہندکو اور پشتو ہے مگر اردو میں شعر کہتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں شاعری کی ابتداء کی۔ قدرتی موزونیت، فکر رسا اور محنت سے شعر موزوں کرنے لگے۔ تین سال حیدرآباد سندھ میں قیام رہا۔ یہاں منعقد ہونے والے تمام مشاعروں میں موصوف شرکت کرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں پشاور واپس آ گئے۔ اور سید فارغ بخاری کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی توجہ و تربیت سے بہت جلد ترقی کر گئے اور پشاور کے اچھے سخنوروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ پشاور و بیرونجات میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کر کے داد تحسین حاصل کرنے لگے۔

ساحر مصطفائی ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں۔ پرانے اخباروں کے لفافے بنا کر بیچتے ہیں۔ اس سے جو کچھ یافت ہوتی ہے اسی میں گزر بسر کرتے ہیں۔ خاموش طبع، منکسر المزاج، درد مند اور شریف النفس آدمی ہیں۔ آپ نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں اور دکھوں کو اشعار کی صورت میں ڈھالا ہے۔ لیجیے ساحر مصطفائی کے مافی الضمیر کو اشعار کی صورت میں ملاحظہ کیجیے اور ان کے کمال فن کی داد دیجیے۔

غزل

ہو گیا مفلوج میرا ذہن تدبیروں کے ساتھ
خال و خد بھی بجھ گئے یادوں کی تصویروں کیساتھ

زہر کا پیالہ، دہکتی آگ عیبر دل گداز
بس یہی کچھ ہو رہا ہے آج تک پیروں کیساتھ

بجھ گئے پلکوں کے جگنو ورنہ پہلے دل میرا
ایک جنگل تھا مگر روشن تھا تنویروں کیساتھ

اپنی تنہائی کے لمحے کاٹنے کے واسطے
کھیلتا رہتا تھا دروازے کی زنجیر کے ساتھ

یہ کرم کیا کم تھا ساحر ساتھ وہ چلتے رہے
عمر بھر کوئی کہاں چلتا ہے رہگیروں کے ساتھ

ساحر کی ایک اور غزل ملاحظہ کیجیے ؎

جو موسموں کی اذیت کے زخم دھو جائے
کوئی تو ہو جو صداقت کے بیج بو جائے

کوئی تو آ کے مری ان اداس پلکوں میں
نشاطِ درد کی رنگینیاں پرو جائے

ہر ایک چہرہ پہ دیکھوں گلاب سا چہرہ
ہوا نہیں یہ مگر دل میں ہے کہ ہو جائے

تجھے یہ فکر کہ دنیا نکل گئی آگے
مجھے یہ ڈر ہے کہ انساں کہیں نہ کھو جائے

مہک اٹھیں گے گلوں سے یہ راستے ساحر
خدا کرے وہ کسی دن یہاں سے ہو جائے

چند منتخب اشعار

جو خونِ دل کے طلاطم میں ڈوب کے نکلے　　غزل میں شعر وہی لازوال ہوتا ہے

سیلِ غمِ حیات سے تو بچ گیا مگر　　ساحرؔ میں اپنے دل کے طلاطم میں بہہ گیا

ہجومِ دید میں آتے ہیں ایسے لمحے بھی　　نظر ملا کے ہٹانا محال ہوتا ہے

رات کی باہوں میں آخر سو نہ جائے زندگی　　صبح کے آثار تو ساحرؔ نہیں آتے نظر

جہاں جاتا ہوں یوں لگتا ہے جیسے　　ہزاروں بار یاں آیا گیا ہوں

جو فاقہ کش ہیں ہمیشہ وہ فاقہ کش ہی رہیں　　کسی کتاب میں ساحرؔ کہیں لکھا تو نہیں

ہم بھی تڑپے ہیں رات بھر ساحرؔ　　ہم نے بھی رت جگا منایا ہے

تو آئینہ ہے تو پھر میں بھی عکس ہوں تیرا　　مرے وجود سے قائم ہے آبرو تیری

جب بھی دستک پیار سے دیگا تو وا ہو جائیگا　　غیر بھی دستک پیار سے دیگا تو وا ہو جائیگا

کیوں ہم پر ہی نگاہ کسی کی ٹھہر گئی　　بسمل بہت تھے کوچۂ قاتل میں دوستوں

میں چاہتوں کے الاؤ میں جل جاؤں نہ کہیں　　کہ اپنے زخموں سے آنے لگی ہے بو تیری

ساجد سرحدی

خادم حسین نام اور ساجد سرحدی تخلص ہے۔ یہ ۲ر فروری ۱۹۳۶ء کو پشاور شہر میں پیدا ہوئے، بچپن میں قسم قسم کی بیماریوں کا شکار ہوتے اور ریبیا لاڈو پیار کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ گئے۔ بچپن تو کافی آرام سے گزر گیا مگر والد کے انتقال کے بعد آلام و مصائب نے زندگی اجیرن کردی، لاچار پشاور کے سرکاری پریس میں نوکری کرلی۔ تیرہ[۱۳] برس پریس کی نوکری میں موصوف کو کچھ پڑھنا لکھنا ضرور آگیا مگر ترقی نہیں ملی۔ مجبوراً نوکری چھوڑ کر کپڑوں کی پھیری لگانے لگے۔ جس سے قدرے بہتر گزر اوقات ہونے لگی۔

ساجد کو کسی اسکول میں پڑھنے تو نہیں بٹھایا گیا البتہ باپ نے گھر پر "پنج گنج"، "شکوہ و جواب شکوہ" "مسدس حالی" وغیرہ ضرور یاد کرادیں جس سے ساجد میں شعر و شاعری سے رغبت پیدا ہوگئی۔

خاندان میں دادا، باپ اور چچا شعر کہتے تھے۔ ان کے نوحے اور خاکسار تحریک کے لئے کہی ہوئی قومی نظمیں پشاور میں کافی مقبول تھیں۔ ساجد نے اپنی شاعری کا آغاز بھی نعت و نوحہ سے کیا اور بہت جلد عوامی حلقوں میں سرحدی صاحب کے نام سے مشہور ہوگئے۔

ساجد کی مادری زبان ہندکو اور پشتو ہے مگر اُردو میں بھی اشعار کہتے ہیں اور اچھا کہتے ہیں۔ موصوف اس وقت بزم بہار ادب، سنڈیکیٹ آف رائیٹرز، حلقۂ ارباب ذوق، ہندکو لٹریری سوسائٹی وغیرہ میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں اور اپنی تخلیقات پر داد تحسین حاصل کررہے ہیں لیجئے کلام ملاحظہ کیجئے۔

غزل

خدایا اب تو بدل دے میری حیات کا رنگ / بدل رہا ہے تیری ساری کائنات کا رنگ

پہنچتا جاتا ہے جوں جوں تباہی کے نزدیک / نکھرتا جاتا ہے دُنیائے بے ثبات کا رنگ

میرے جہاں کو ضرورت ہے ایسے لوگوں کی / مٹا سکیں جو زمانہ سے ذات پات کا رنگ

مجھے گماں ہے کہ تم بھی بدل نہ جاؤ کہیں / بدلتے دیکھا ہے میں نے تمہاری بات کا رنگ

رقم جو سرخیٔ خونِ جگر سے ہو ساجد
ہمیشہ رہتا ہے ایسی نگارشات کا رنگ

منتخب اشعار

ستم گری میں جو رکھتا نہیں جواب اپنا / میں اس سے کیسے دلِ ناتواں کی بات کروں

جسے میں چارہ گر سمجھا تھا اپنا / اسی کے ہاتھ میں خنجر کو دیکھا

گردشِ تقدیر کا ساجد نہ کر شکوہ کوئی / ایک تو ہی نہیں سارا جہاں گردش میں ہے

کل جس کو تراشا تھا میرے ہاتھ نے ساجد / کیا آج اُسی بُت کو خدا کہنا پڑے گا

کوئی دکھائے ہمیں لاکھ چاند سے چہرے / مگر پسند ہمیں آپ ہی کا چہرہ ہے

چاہتے ہو گر زمانے میں محبت کا نظام / آؤ مِل کر سب کریں اقرارِ امن و آشتی

شفیق لکھنوی

سیّد احمد حسین نام اور شفیق تخلص تھا۔ عام طور پر ننھو صاحب اور ننھو آغا کے نام سے مشہور تھے۔ یہ مفتی گنج لکھنؤ میں ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ یہ الف کے نام ب نہیں جانتے تھے حتیٰ کہ نام تک لکھنا نہیں آتا تھا۔ تاہم مبدءِ فیاض نے بلا کا حافظہ و موزونیتِ طبع عطا کئے تھے۔

شاعری سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اس فن میں بھی کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا تھا۔ الشعراء تلامیذ الرحمٰن کے مصداق اپنی مشقِ سخن جاری رکھی۔ ہر صنفِ سخن میں بہت کچھ کہا ہے۔ خصوصی طور پر مرثیہ، سلام، نوحہ رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔ شفیق ایک عرصہ تک بغیر اصلاح و مشورہ فکرِ سخن کرتے رہے بالآخر ایک ایسے شفیق استاد کی ضرورت ہوئی جو اس کوچے کے نشیب و فراز سے آگاہ کر سکے۔ اس کے لئے شفیق نے ابو محمد جلیس سے شرفِ تلمذ حاصل کیا جو ایک مشّاق شاعر اور میر انیس مرحوم کے پوتے تھے۔ عرصہ دراز تک شفیق ان کی اصلاح سے فیضیاب ہوتے رہے۔ آخر کسی موضوع کی اصلاح پر اختلافِ رائے پیدا ہو گیا اور شفیق پیارے صاحب رشید کے شاگرد ہو گئے۔ رشید نے ان پر پوری توجہ دی اور رموزِ فن بطریق سینہ تعلیم فرمایا جس سے شفیق کی معلومات وسیع ہو گئیں اور رشید کی وفات کے بعد شفیق کو کسی اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

لکھنؤ میں انجمن معین الادب کے زیرِ اہتمام مشاعرے منعقد ہوتے تھے اور وصل بلگرامی کے زیرِ ادارت رسالہ "معیار" نکلتا تھا۔ اس میں شفیق کا کلام اکثر شائع ہوتا تھا۔ ۱۳۳۵ھ میں "عطیہ النبی" کے نام سے شفیق کا دیوان بھی چھپا ہے جو اب نایاب ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ مرثیے، نوحے قصائد، قطعات اور قومی نظمیں موجود تھیں۔

ابتداء میں شفیق اپنے اُمّی ہونیکا اظہار کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ آخر میں علی الاعلان اُمّی ہونے کا اقرار کرنے لگے۔ چنانچہ کہتے ہیں

؎ دیوان ہوا مرتب دیکھے گا ایک زمانہ
انپڑھ ہوں یا الٰہی عزت میری بچانا

؎ میرے احباب یہ کہتے ہیں کہ جاہل ہے شفیق
ہے بہت جائے عجب اس کا غزل خواں ہونا

؎ تم سے انپڑھ بھی بہت دنیا میں گذرے اے شفیق
اک دیوان کرلیا موزوں تو اس پر کیا گھمنڈ

شفیق کے کلام میں گل و بلبل، رخ و عارض کے مضامین کی کثرت ہے مگر انہوں نے اپنے خیالات بنہایت صفائی و سادگی سے نظم کئے ہیں جو ان کی بے علمی سے بعید ہے۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

ایک دن آنے کا ایک سوئے حرم جانیکا
رسم ہے خلق میں دو روز کا مہماں ہونا

میں اپنی تیرہ بختی کا اگر احوال لکھتا ہوں — سیاہ حرفوں سے رویا کرتا ہے اکثر قلم میرا
تمہاری زلف کے کوچے میں ڈر ہے لٹنے کا — اندھیری رات میں جاتا ہے قافلہ دل کا
دستِ طلب بڑھا تو تمکنات بھی گئی — مرنے کے بعد کیا کفِ سائل میں رہ گیا
یہ قاعدہ ہے صانع قدرت کا بنایا — اک پاؤں کے اک پاؤں برابر نہ اٹھے گا
فرقت کی ناامیدیاں کیسی بہار بھی جا — رو کے ہوئے ہیں مجھ کو امید وصال کی

شفیق کی ایک غزل کے چند اشعار سے

پھر تجھے ہم نذر دیں گے اے خدنگِ نازِ یار — اور دل ممکن جو کوئی تیرے قابل ہو گیا
چاک دامن تو کیا یوسفؑ کا جوشِ شوق میں — رنج سے ٹکڑے زلیخا کا مگر دل ہو گیا
دیکھ کر روتے ہوئے مجھ کو تمہیں ہنسنا تھا — برق کے گرنے سے بیتاب دل ہو گیا

ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے

اک جوانی کا سبب اور پیارِ ماں ہونا — سخت مشکل ہے مری موت کا آساں ہونا
کارگر پند و نصیحت نہیں ہوتی اس کو — جسکی تقدیر میں لکھا ہو پریشاں ہونا
گر اسی طرح ہیں غارت گرِ دنیا ترے ظلم — میری نظروں میں ہے عالم کا بیاباں ہونا
مجھ کو عسرت میں حیا آتی ہے یا رب اس کی — تیری موجودگی اور غیر کا احساں ہونا

مختلف اشعار

نکل کر گھر سے ناواقف الٰہی کس طرف جائے — کہ جس نے راستہ دیکھا نہ ہو الفت کی منزل کا
بس اتنا مال ہو جو کام آئے ہر ضرورت میں — وہی ہے سلطنت احباب جنکے ہوں وطن اپنا
جس دن سے ہم نے چھوڑ دیا شغلِ مے کشی — کیا کیا گھٹائیں اٹھتی ہیں میخانے کی طرف
ہمارے قتل کو ہے جنبشِ ابرو فقط کافی — غضب ہے آپ کیوں کھینچے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں

قید سے چھوٹ کے مجبور وہیں بیٹھے رہے
کیا کریں وہ کہ جنھیں طاقت پرواز نہ ہو

شفق دہلوی

دولت رائے نام اور شفق تخلص تھا۔ مولد و مسکن دہلی تھا۔ یہ قوم کا ہندو اور پیشے کے لحاظ سے گلفروش تھا۔ چاوڑی بازار میں دوکان پر مشتاقانِ سخن کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ خریدار پھول کے ہار اور گجرے خریدنے کے ساتھ شوقِ سماعت بھی پورا کرتے تھے۔ شفق خوبصورت جوان ہونے کے علاوہ شگفتہ مزاج اور ملنسار بھی تھا۔ یہ علم سے قطعی بے بہرہ تھا لیکن استاد ذوق کے فیضِ صحبت نے شاعر بنا دیا تھا۔ مشاعروں میں اس کے پڑھنے کا انداز موثر و دلکش ہوتا تھا۔ غزل کے ساتھ ٹھمری اور ٹپہ بھی کہتا تھا جس میں پھلرنگ تخلص کرتا تھا۔ دہلی کی مشہور گانے والی نصیبا پر بری طرح فریفتہ تھا جب طوائفِ مذکور نے کسی دوسرے چاہنے والے سے نکاح کر لیا تو شفق نے دل برداشتہ ہو کر دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ تراوشِ طبع کا حاصل ملاحظہ کیجیے ۔

پس از مردن بھی گردش ہے زبس تحریر تقدیر میں
بگولے کی طرح رہتی ہے میری خاک چکر میں

الہٰی کیا کرے دیوانۂ الفت کہاں جائے
قرار آتا ہے صحرا میں جی لگتا ہے جب گھر میں

خدا کے سامنے آنے تو دو مغرور قاتل کو
قیامت ہم بھی اک برپا کریں گے آج محشر میں

فراقِ یار میں کیا لطف ساقی بادہ نوشی کا
بجا لے مے ذرا سا زہر بھر دے میرے ساغر میں

دلِ مرحوم کا مدفن زیارت گاہ بن جائے
شفق چھوٹی سی اک تربت بنا دے کوچۂ دلبر میں

شاکر اعظمی

عبدالشکور نام، شاکرؔ اعظمی تخلص تھا۔ یہ ۱۹۰۴ء میں مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے مزاج میں آزادی و بے راہ روی تھی۔ بدقسمتی سے گھر میں تعلیمی ماحول بھی میسر نہ آیا۔ نتیجتاً تعلیم سے یکسر محروم رہا۔ بچپن کھیل کود اور جوانی بے مصرف سرگرمیوں میں بسر ہوئی۔ زمیندار گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے نیک خو، سادہ لوح اور ملنسار تھا۔ خوش قسمتی سے اعظم گڑھ کے معروف عالم دین شاہ ولی اللہ صاحب کے فیضِ صحبت سے رنگ رلیوں کی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور بقیہ زندگی عبادت و ریاضت میں گذار دی شعر و شاعری سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔ حافظہ اچھا تھا۔ فطری ذہانت، موزونیت اور شوق کی وجہ سے شعر کہتا تھا۔ ابتداء میں عمر گورکھپوری سے اصلاح لیتا تھا۔ بعد ازاں مولینا فیض الحسن فیض اعظمی سے مشورہ سخن کرنے لگا۔ کلام پراثر و دلنشیں کہتا تھا اور بہ ترنم سے پڑھتا تھا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

غزل

ساقی یہ تیری بزم کا کیسا نظام ہے
لبریز ہے کہیں تو کہیں خالی جام ہے

اتنے قصور پر بھی ہیں بندہ نوازیاں
اے شانِ ذوالجلال یہ تیرا ہی کام ہے

رتبہ تو دیکھئے کہ وہ پہنچیں ہیں عرش پر
خلوت ہے اور ان سے خدا ہمکلام ہے

جرأت کہاں سوال کی منکر نکیر کو
یہ جاں نثارِ امتِ خیر الانام ہے

کیا پوچھتے ہو مجھ سے مرا حالِ اضطراب
کچھ بات ہے کہ آہ و فغاں صبح و شام ہے

دیر و حرم میں کیجئے کیوں جستجوئے یار
شاکرؔ جب اسکا خانۂ دل میں مقام ہے

شمع لاجپوری

رقیہ بی نام، شمع تخلص تھا۔ ۲۲ جولائی ۱۹۲۳ء کو قصبہ لاجپور ضلع سورت (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ مادری زبان گجراتی تھی لیکن شعر اردو میں کہتی تھیں۔ باپ نے شمع کی ماں سے اس کے بچپن ہی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس لئے شمع کی ماں کے زیر سایہ مذہبی ماحول میں تربیت ہوئی۔ سترہ سال کی عمر میں شادی ابراہیم خلیل سے ہو گئی جو ایک ترقی پسند اور قومی درد رکھنے والے شخص تھے۔ بعد ازاں اپنے شوہر کے ساتھ جنوبی افریقہ چلی گئیں۔ سسرال میں شعر و ادب کی محفلیں اکثر منعقد ہوتی تھیں۔ شمع کو ان محفلوں سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا اور وہ شعر موزوں کرنے لگیں اور امینہ نازؔ سے اصلاح لینے لگیں جنہوں نے شمع کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

مانگوں میں دعا یہ تجھ سے خدا یثرب میں گزارا ہو جائے
بس اتنی تمنا ہے میری اس در کا نظارہ ہو جائے

طیبہ کی طرف جو جاتے ہیں وہ تھام کے دل رہ جاتے ہیں
کچھ لطف و کرم کا ہم پر بھی بس ایک اشارہ ہو جائے

تجھ دیکھ لے گر یہ مجبوری کٹ جائے گی فوراً یہ دوری
اور پھر تو مدینہ دور نہیں جب تیرا سہارا ہو جائے

بے زر ہی سہی۔ ناچار ہی سہی، پھر بھی ہوں امید دل سے بھری
ایک بار میری بھی قسمت کا روشن جو ستارہ ہو جائے

بن دیکھے مدینہ مر جاؤں تو چین نہ ہرگز میں پاؤں
حسرت میری گھر لے جائے کیسے گوارا ہو جائے

شورؔ فرانسیسی

برِّ صغیر پاک و ہند میں یورپی ممالک کے اکثر لوگ تجارت و ملازمت کی غرض سے آئے اور یہیں بود و باش اختیار کرلی۔ یہاں کی ثقافت اختیار کرنے کے علاوہ اردو زبان میں نغمہ سنجی بھی کی۔ برطانوی فرانسیسی اور یوروپین شعراء میں جارج پیش شورؔ نے سب سے زیادہ شہرت پائی، شورؔ کے باپ جان پیش فرانسیسی الاصل تھا۔ ماں میڈیلین جرمن نژاد تھی جو مشہور جرمن شعراء اردو فراسوکین کی صاحبزادی تھی۔ شورؔ کے سترا بہن بھائی تھے۔ لیکن ان میں شورؔ نے خاصا نام پیدا کیا۔ اس نے چھ دواوین ایک مثنوی اور ایک بیاض چھوڑے ہیں جو اس کی معنوی اولاد خیال کئے جاتے ہیں۔ خود شورؔ کو بھی اس پر فخر تھا۔ چنانچہ کہا ہے ؎

کر کے خونِ خشک یہ اشعار کئے ہیں پیدا
تاکہ اے شورؔ میرے بعد یہ اولاد رہے

شورؔ ۱۸۲۳ء میں کول ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوا۔ مذہباً عیسائی تھا۔ مگر انہوں نے اسلامی معاشرت اختیار کرلی تھی۔ وضع قطع کے لحاظ سے مسلمان دکھائی دیتا تھا۔ ہمیشہ انگرکھا۔ دوپلی ٹوپی، سلیم شاہی جوتی اور تنگ پجامہ زیب تن کرتا تھا۔ شورؔ نے آغازِ شباب کے ساتھ ہی مشقِ سخن شروع کردی تھی۔ اس فن میں رحیم بیگ میرٹھی اور رشید دہلوی سے مشورہ سخن کرتا تھا۔ غزل جو اہلِ مغرب کے لئے ایک اجنبی صنف ہے شورؔ اس میں اچھی خاصی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے مقام کا اندازہ اس سے لگائیے کہ

استاد داغ جیسا استادِ فن نے شور کو مالکِ ملکِ سخن قرار دیا ہے ؎

جارح پیش آں شور صاحب کمال
مالکِ ملکِ سخن طبش بزور

شور نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلوں کے علاوہ مثنویاں رباعیاں، قطعات، مخمس، مسدس، قصائد اور سہرے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ نمونہ کلام حاضر ہے۔

قطعہ

کعبہ میں تو صدق و صفا کو پایا
بت خانہ میں ناز و ادا کو پایا
حاصل نہ ہوا کہیں سے دل کا مقصد
جب خود ہی ڈھونڈا تو خدا کو پایا

مثنوی۔

لکھوں شہر کے اب عمائد کا حال
کہ کیا کیا یہاں لوگ تھے بے مثال
تھے اک مولوی یاں کے صدر الصدور
کہ ثانی نہ تھا ان کا نزدیک و دور
خدا نے انہیں رتبے اعلیٰ دیئے
کہ مفتی عدالت میں بھی وہ ہوئے
تخلص تھا آزادہ شعر انتخاب
وہ دہلی میں شاعر بھی تھے لاجواب
نہ زندہ رہے ہائے صہبائی بھی
گئی غدر میں جاں یوں مفت ہی
گئے ان کے ہمراہ لختِ جگر
مرے ساتھ سنتے ہیں دونوں پسر

سہرا

سر پہ دولہا کی زرافشاں جو سجایا سہرا
شعلۂ طور سراسر نظر آیا سہرا

حوریں جنت سے جو پھولوں کا بنا کر لائیں
اپنے جامہ میں نہ پھر پھولا سمایا سہرا

سلکِ گوہر سے بنا کر جو سجایا اس کو
کہکشاں کو بھی دل و جان سے بھایا سہرا

خوشبو اس سہرے جب گلشنِ عالم میں اڑی
بلبلوں نے بھی خوش آواز سے گایا سہرا

شورؔ نے ہاتھ ملا نوشہ کے والد سے کہا
لو مبارک ہو خدا نے یہ دکھایا سہرا

غزل :-

تم نے ہنس کر وہاں گذاری رات
یہاں رو کر کٹی ہماری رات

رہا ابرو کا دھیان ساری رات
تیغ سے کٹ گئی ہماری رات

صبح تک ہر ادا پہ جان گئی
خوب کی ہم نے جانثاری رات

دن میں زلفوں کو وہ بنا یا گئے
خواب دیکھا کیا یہ ساری رات

یار ہو، چاندنی ہو، اور مے ہو
دے خدا ایسی پیاری پیاری رات

کنگھی چوٹی میں کاٹ دی شبِ وصل
عجیب اندھیر میں گذاری رات

شورؔ میں جب تعلق ہے کچھ باقی
صبح پھر کیا جو گذاری رات

صنم اکبر آبادی

صنم کا اصل نام درگا بائی تھا۔ یہ آگرہ کی مشہور رقاصہ تھی۔ نوعمر، دبلی پتلی پیشانی پر قشقہ لگا ہوا۔ نہایت ہی حسین و جمیل تھی، قدرت نے ظاہری حسن کے علاوہ حسنِ سیرت بھی بخشا تھا۔ شعر گوئی کا بے حد شوق تھا۔

۱۸۵۶ء میں بابو منی پرشاد وکیل نے آگرہ میں محفلِ مشاعرہ منعقد کی تھی جس میں آگرہ کے ممتاز شعراء کے علاوہ بیرونجات کے مقتدر سخنوران نے شرکت کی تھی۔ مرزا غالب نے بھی خصوصی دعوت پر اس محفلِ مشاعرہ کو زینت بخشی تھی۔ اربابِ محفل کے بیحد اصرار پر اس بزم شعر و سخن کا آغاز صنم ہی کے کلام سے ہوا۔ صنم کی یہ غزل ناظرین کی دعوتِ طبع کے لئے پیش کی جا رہی ہے۔

غزل

کچھ دوائے دل و جگر نہ ہوئی — مر گئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی
اپنی صورت مشابہی دی ہم نے — ان کی اس پر بھی کچھ نظر نہ ہوئی
دل پہ تاثیر کر گئی ان کے — شکر ہے آہ بے اثر نہ ہوئی
دل و جان ہجر میں گئے ایسے — ایک کو ایک کی خبر نہ ہوئی

رہیں اب دیر ہی میں چل کے صنم
اپنی کعبہ میں تو بسر نہ ہوئی

صفیہ مراد آبادی

صفیہ بیگم نام اور صفیہ ہی تخلص تھا۔ یہ یوپی کے نامور ادیب و سابق پارلیمنٹری سکریٹری اتر پردیش مولوی حمید احمد مسعود شیخوپوری کی رفیقۂ حیات تھیں۔ والد مرزا محمد تقی انگریزی عہد حکومت میں سررشتہ دار و پیش کار تھے۔ صفیہ ۱۹۰۴ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئیں اور اس زمانے کی رسم کے مطابق خاندان کے بزرگوں سے ابتدائی گھریلو تعلیم حاصل کی۔ شعر و ادب کا ذوق صفیہ کو ورثہ میں ملا تھا۔ ان کا خاندان پہلے سے ادبی ذوق کا مالک تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں شوہر اور سسرال دونوں ادبی ذوق والے میسر آئے۔ ان کے گھر پر روزانہ صاحبانِ علم و ادب جمع ہوتے تھے اور شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ صفیہ بھی اس شاعرانہ ماحول سے متاثر ہوئیں اور اس طرح شعر موزوں کرنے لگیں۔ ابتداء میں قاضی غلام سجاد بسمل بدایونی کو کلام دکھاتی تھیں۔ بعد میں جب لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گئیں تو مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل کر لیا۔ اثر صاحب کی توجہ اور اصلاح سے بہت جلد ترقی کر گئیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

ہزار بار کی توبہ سے ایک توبہ بھی
کسی کی بات کا اب اعتبار کون کرے

ہو گئی یہ بھی ادائے حسن کوئی
روٹھ جاتے ہیں وہ منانے سے

حسن میں ہی جنوں کے ہیں انداز
بھاگ جاتے ہیں وہ بلانے سے

نیا زمانہ، طبیعت نئی، اصول نئے
نیا چمن ہے یہ، پودے نئے ہیں پھول نئے

پئے تعظیم کھڑی ہوگئی اُٹھ کر صفیہ
جب سنا بزمِ سخن میں اثر آتے ہیں

صہبا اکبرآبادی

نام مسیح الدین خلف حاجی فصیح الدین (مرحوم) اور صہبا اکبرآبادی تخلص تھا۔ یہ آگرہ میں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔

قدیم دور میں شعر گوئی کو ایک فن اور قابلیت سمجھا جاتا تھا اس لئے ہر کس وناکس اس طرف مائل و متوجہ تھا اور حتی المقدور اس میں ترقی کرنے کی کوشش کرتا تھا صہبا بچپن ہی میں شاعری کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے۔ ابتداء میں خود ہی شعر موزوں کرتے تھے۔ جب استاد کی ضرورت کا احساس ہوا تو صبا اکبرآبادی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ استاد کی توجہ، شوق اور محنت نے ان کے گیسوئے فن کی مشاطگی کی ہے اور ان کے عارضِ ادب کو تابناک کیا ہے۔

صبا اکبرآبادی کے یہ مایہ ناز شاگرد اپنی حیثیت میں یوں منفرد ہیں کہ کسی درسگاہ کی سند کے شرمندۂ احسان نہیں قدرت کی بخشش و عطا کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ کلام کی بلاغت، تراکیب، بندش، موزوں الفاظ کا برجستہ استعمال ان کی قادرالکلامی کا بیّن ثبوت ہے۔ کلام دلی و آگرہ کے قدیم تمدن کا آئینہ ہے۔ جسمیں شوکتِ الفاظ کیسا تھ حقیقت اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔ شعر پڑھنے کا انداز نہایت دلکش و موثر تھا اپنی گرج دار آواز سے اکثر مشاعروں پر چھا جاتے اور خوب خوب دادِ تحسین حاصل کرتے تھے۔

نمونۂ کلام حاضرِ خدمت ہے۔

غزل

روشنی تیرگی سے نکلتی رہی — شمع بجھتی رہی شمع جلتی رہی

رفتہ رفتہ اجالے سحر کو ملے — رات ڈھلتی رہی رات ڈھلتی رہی

گھر کے اندر جلایا تھا ہم نے دیا — روشنی گھر سے باہر نکلتی رہی

آگ ہی آگ تھی دشت تنہائی میں — دن سلگتا رہا، رات جلتی رہی

گھر کے آنگن کی تنہائیاں کیا کہوں — چاندنی رات پہلو بدلتی رہی

اس گدازِ طبیعت نے مارا ہمیں — شمع جلتی رہی اور پگھلتی رہی

پر لگا کر نہ صبا اڑے ہم کبھی
جو ہوا چل رہی تھی وہ چلتی رہی

نعت

لائقِ حمد، محمدؐ محمود — عبدِ معبود و حبیبِ معبود

اس کے قدموں میں جھکا جاتا ہوں — جس کے ہونٹوں پہ ہے پیغام سجود

نورِ حق نورِ محمدؐ کی قسم — نگہِ شوق ہے مصروفِ سجود

فرش والوں نے دلوں میں رکھا — عرش والوں نے بنایا مسجود

تیرے محبوب کے قدموں پہ سہی — سجدۂ شوق ہے میرا مقصود

ذرا احمدؐ کو نہ کیوں کعبہ کہوں — عشق میں کیسے رسوم اور قیود

زندگی کا یہ مزا ہے صہبا
اک اک سانس ہے وقفِ درود

ضیاء ٹھٹھوی

میر ضیاء الدین ضیا خلف سید عزت اللہ ٹھٹھہ کے شکر الٰہی شیرازی سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور مورخ و شاعر میر غلام علی شیر قانع ٹھٹھوی کے سب سے چھوٹے بھائی تھے اور اپنے بھتیجے میر عظیم الدین، ابن یار محمد کے ہمعصر و ہم عمر تھے۔ یہ میر پور خاص کے والی میر ٹھارہ خان بن میر فتح خان مانکانی کے دربار سے وابستہ تھے۔ فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ آپ نے ۱۸۰۰ء میں عظیم کی مثنوی ہیر و رانجھا کو فارسی میں منظوم کیا ہے۔

ضیار نے فارسی کے علاوہ اردو میں بھی فکر سخن کیا ہے اور ایک دیوان بطور یادگار چھوڑا ہے۔ جسمیں غزل، قصیدہ، مستزاد، ترجیع بند مخمس اور مسدس غرضیکہ ہر صنف سخن کے اشعار موجود ہیں۔

ضیار میر تقی میر، سودا اور میر حسن کے ہمعصر تھے۔ ضیاء سودا سے متاثر بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے سودا کی یہ غزل (بحذف پانچ اشعار) کہے ہیں۔

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ وہ نین ہیں جن سے کہ جنگل بھرے ہوئے
اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوج اشک
لخت جگر کی لاش کیوں آگے دھرے ہوئے
مجلس سے چھوکروں کے جو حجرے سے شیخ جی
آوے تو پھر خدا نے کیا مسخرے ہوئے
سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے
لڑکے پھریں ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے

ضیاء کی اردو غزل کے چند اشعار

دکھا کر رخ کوں اے ظالم چھپاؤ گے تو کیا ہوگا
کہانی عشق کی کہہ کر بلاؤ گے تو کیا ہوگا

کیا ہے برہ نے تیرے مرے دل کو پتنگ مانند
بجھا کر عشق کی آتش جلاؤ گے تو کیا ہوگا

نہ پاؤں نیند نینوں میں گھڑی تجھ بن ارے پریتم
سمجھ کر اپنے عاشق کوں ستاؤ گے تو کیا ہوگا

شہادت کی مجھے ہے آرزو مندی سدا دل میں
برہ کے ہاتھ کا بھالا لگاؤ گے تو کیا ہوگا

جدائی کی نہیں طاقت رہی ہے مجھ کو اے دلبر
اگر ٹک پاس اپنے مجھ بلاؤ گے تو کیا ہوگا

محبت اتنی کرتی ہیں رقیباں سُں ارے ظالم
مروت میں اگر اتنا ستاؤ گے تو کیا ہوگا

درس کی مانگتا بھیا ضیاء الدین سدا تیری
اگر تم مہر سوں آکر دکھاؤ گے تو کیا ہوگا

maablib.org

طالبؔ لکھنوی

نام مولوی الہ داد عرف شبراتی اور تخلص طالب لکھنوی تھا۔ بچپن میں مرض چیچک سے آنکھیں جاتی رہیں اس لئے رسمی طور پر تعلیم حاصل نہیں کر سکے تاہم اسی عالم نابینائی میں لکھنؤ کے ملا حسن سے قرآن مجید حفظ کیا اور درسی کتابیں پڑھیں۔

گلستان سخن میں حافظ طالب کے نام سے جن کا ذکر ہے وہ یہی بزرگ ہیں۔ موصوف کا انتقال ۱۸۵۸ء میں ریاست رامپور میں ہوا۔

شعر و شاعری میں مولوی قدرت اللہ شوق سے مشورہ کرتے تھے اردو کلام کا نمونہ "انتخاب یادگار" میں چھپا ہے جس میں قصائد حمد و نعت اور عاشقانہ کلام ہے۔

قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے

درج ذیل چند اشعار دیوان ریختہ سے پیش کئے جاتے ہیں ؎

ریختہ

ہر چند رو سیہ میں بی نور و بی بصر تھا — لیکن برنگ سرمہ منظور ہر نظر تھا
جا بجا بن گئی یکجتی تری دیوانوں کے — خاک اوڑاؤں میں کہاں نام کو صحرا نہ ملا
جای خون سرخی گل تھی اوس میں — چیر کر جب دل بلبل دیکھا
نہ اوٹھا شور قیامت سی میں — منتظر ہوں تری ٹھوکر لینے کا
اور اچھا ہوا نظارۂ دشمن سی بچی — رکھدیا روزن دیوار میں پڑھکر کاغذ
فتنۂ شور قیامت دیکھیں چونک پڑی — چاہیے تم کو بھی اتنا دم رفتار لحاظ
چیر سی سینی کو شوق کیجیو دل دلگیر کو — یہ ہی دو جاگہ ہیں اور کیا کہا گیا میں تیر کو
سب ہم صفیر اوڑ گئی صیاد دام سی کا — پر ہم تھی اور ڈھب کی گرفتار رہ گئی
میں تو ہوں محو ہجوم آرزو فرمایی — آپ سی ہر دم بہلا کیا کیا اجازت چاہیے

تضمین

کن شاد مرا ز بوس و کنار — بده کام دل یک زمان ای نگار
چو دی شد بفردا امید از کار — همین اندکی شب غنیمت شمار
چه می خسپی ای فتنۂ روزگار — بیا و می لعل نوشیں بیار

مثنوی

ای مظہر رحمت الٰہی — ای عین عنایت الٰہی
ای نور فزای چشم آدم — ای باعث ہستی دو عالم
ای ختم رسل شفیع محشر — ای مالک آب حوض کوثر
ای قبلۂ دین و شاہ کونین — ای صدر نشین قاب قوسین
ای ابر کرم سحاب احسان — ای لطف خدا حبیب یزدان
ای عذر پذیرای خطا پوش — با خلق کریم در کرم کوش
ای گوش نہ ندای طالب — مقبول ہو یہ دعای طالب

عاجز بھوپالی

صالحہ خانم نام، عاجزؔ تخلص تھا۔ یہ بھوپال کے نامور شاعر کیفؔ بھوپالی کی والدہ اور ذکی وارثیؔ کی ہمشیرہ تھیں۔ موصوفہ نے صرف اپنے والد خواجہ محمد اسمٰعیل سے گھریلو تعلیم حاصل کی۔ شعر و شاعری سے انہیں دلی لگاؤ تھا۔ جو کچھ موزوں کرتیں اسے سراج میر خان سحرؔ کی اصلاح سے مزین کر لیتی تھیں۔ استاد کے انتقال کے بعد اپنے بھائی ذکی وارثیؔ سے اصلاح لینے لگیں۔ حمد و نعت سے خاص شغف تھا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

پلا ساقی مئے وحدت کہ دل سرشار ہو جائے
مگر سرشار ایسا ہو نہ پھر ہوشیار ہو جائے
تمنا جاہ و حشمت کی نہیں گر ہے تو یہ ہے
نگاہ لطف ہم پر احمد مختار ہو جائے
میں عاصی پُر معاصی ہوں شہا مجھکو بچا لینا
کہیں ایسا نہ ہو محشر میں گردوار ہو جائے
سفینہ بحرِ عصیاں کے بھنور میں جا پڑا آقا
ذرا ٹھوکر لگا دینا کہ بیڑا پار ہو جائے

گذرے فراخ دستی سے یا مفلسی کیساتھ
وابستہ تیری یاد سے زندگی کیساتھ
برلائے آرزوئے دل یا خدائے پاک
تیری طلب میں عمر کٹے بیکلی کیساتھ
دریائے شوق دل میں ہو ہر لحظہ موجزن
جان اور مال تجھ پہ فدا ہو خوشی کیساتھ
مانگنا ہے مانگ لے ربِ غفور سے
دستِ طلب بڑھا کے بہت عاجزی کیساتھ
عاجزؔ رضائے حق کی نہیں ہے جسے تلاش
جینا ہے اس کا دہر میں بے عزتی کیساتھ

عاشق بھوپالی

جوزف مینک نام، دلارے صاحب عرفیت اور عاشق تخلص تھا
عام طور پر دلارے عاشق کے نام سے مشہور تھے۔ والد کیپٹن موسس مینک
فرانسیسی الاصل تھے اور ریاست بھوپال کی فوج سے منسلک تھے
عاشق نے بھوپال میں ہی آنکھیں کھولیں اور مسلم گھرانوں کی رسم و رواج
کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ کیپٹن مینک کی تین اولادیں تھیں
دلارے صاحب ان سب میں بڑے تھے۔ یورپی ممالک کے دوسرے
لوگوں کی طرح عاشق نے اردو زبان میں شاعری کی اور خوب
نام پیدا کیا۔

عاشق نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور آگرہ میں ایک شریف خاندان
کی لڑکی سے ان کا عقد بھی ہو گیا تھا۔ وہ نہایت بزلہ سنج اور خوش دل
انسان تھے۔ فنِ سخن میں عاشق کو کسی سے تلمذ نہیں تھا۔ سخت محنت
اور کثرتِ مشق سے اس میں کمال پیدا کیا۔ عاشق کا کلام کسی بھی اہلِ
زبان کے کلام کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

محو نظارہ ہو کس کے نقش تصویر کا
ظاہر دل بدگماں ہے طائر تصویر کا

یار کی چین جبیں کے عشق میں گھستے ہیں
دوستو مارا ہوا ہوں گردشِ تقدیر کا

اشک کے دریا بہے یادِ زلفِ یار میں
ہے گماں اب کے سر پہ دامِ ماہی گیر کا

آج میخانہ میں واعظ بیٹھے پیتے ہیں شراب
شیخ جی قائل ہوں میں آپ کی تدبیر کا

صورتِ فرہاد عاشق پھوڑ کے پتھر سے سر
سنگ سے بھی سخت ہے دل اس بتِ بے پیر کا

خطا ہوئی جو تمہیں دل دیا معاف کرو
کھڑا ہوں کب سے میں دیکھ گنہگار کی طرح

وہ بادہ کش ہوں کہ صوفی ہوں درحقیقت میں
وہ بے خبر ہوں کہ رہتا ہوں ہوشیار کی طرح

❁

گل کس کو، چمن کس کو، کسے سرو سمن یاد
باقی جو ہوا ہے بھی تو رہا گور و کفن یاد

سوزنِ عقل نے گو بخیہ گری دکھلائی
دستِ وحشت نے مگر جامہ دری دکھلائی

اشک کا ہر قطرہ ہے سمند کا جواب
ابرِ نیساں ہے میرے دیدۂ تر کا جواب

نوکِ مژگاں دے رہے ہیں تیر و نشتر کا جواب
دونوں ابرو ہیں ترے شمشیر و خنجر کا جواب

maablib.org

عمرؔ علیگڑھی

محمد عمر فاروق نام اور عمرؔ تخلص تھا۔ پیشے کے لحاظ سے سنجّار تھا اور قطعی صرف ناشناس تھا۔ علی گڑھ میں پیدا ہوا اور کراچی میں انتقال کیا قدرت نے بلا کا حافظہ و موزونیت بخشی تھی۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام پڑھیئے یا سنیئے تو قطعی معلوم نہ ہوگا کہ ایک امّی کا کلام ہے۔ خیال کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ، محاورے، بندش اور سلاست، بیان پر پوری قدرت رکھتا تھا۔ اگرچہ خود علم سے بالکل نابلد تھا تاہم ان سے شرفِ تلمذ حاصل کرنے والو میں علی گڑھ کے اختر انصاری، پروفیسر نسیم قریشی، پروفیسر خورشید الاسلام اور رفوق کریمی جیسے نامور دانشوران شامل تھے۔ بمونہ کلام حاضر ہے ۔

غزل

آپ خود بزمِ تصور میں چلے آتے ہیں
اور ہم موردِ الزام ہوئے جاتے ہیں

جب کبھی یاد وہ آتے ہیں تو یوں آتے ہیں
ہم تڑپتے ہوئے دل تھام کے رہ جاتے ہیں

دل میں رہتا ہے پریشان خیالوں کا ہجوم
بن بلائے ہوئے کمبخت چلے آتے ہیں

لوگ کچھ اتنا اندھیروں سے ہوئے ہیں مانوس
روشنی سامنے آتی ہے تو گھبراتے ہیں

دردو غم یاس والم دل میں جگہ پاتے ہیں
یہی بگڑے ہوئے حالات میں کام آتے ہیں

درحقیقت یہی عنوان ہیں طوفانوں کے
چند قطرے سرِ مژگاں جو نظر آتے ہیں

قطعہ

اٹھا کے پیمانہ دکھلایئے گا آپ
میں ہوگیا خفیف تو کیا پایئے گا
ہر چند جس سے میری نظر بھی نہ اٹھ سکے
اتنا کرم بھی مجھ پہ فرمایئے گا آ

عرشؔ لکھنوی

ملک الشعراء میر تقی میرؔ کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے فیض علی فیضؔ اور چھوٹے میر حسن عسکری عرف میر کلّو۔ میر حسن کا پہلے زارؔ تخلص تھا بعد ازاں عرشؔ تخلص اختیار کیا۔ اور اسی تخلص سے معروف ہوئے عرشؔ کشیدہ قامت، میانہ جسم اور سیاہ رنگ تھے۔ سر پر پٹھے اونچی چولی کا انگرکھا کلی دار پائجامہ اور پاؤں میں کتھیلی جوتی پہنتے تھے۔ بڑے ٹھسّے سے لکھنؤ کے بانکوں کی طرح رہتے تھے۔ حقّہ پینے کے رسیا تھے۔ یہاں تک کہ مشاعروں میں بھی اپنا حقہ ساتھ لیجاتے تھے۔ مشاعروں میں ترتیب خواندگی کے بھی عادی نہ تھے۔ جب دل چاہتا مہتمم مشاعرہ سے اجازت لیکر اپنا کلام سناتے اور حقّہ اٹھا کر رخصت ہو جاتے۔

عرشؔ اپنے باپ میر تقی میرؔ ہی کے شاگرد تھے۔ ان کا اپنے والد کے بعد خواجہ میر دردؔ سے اصلاح لینا مسلّم ہے۔ عرشؔ نے سوداؔ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ تینوں اساتذۂ فن یعنی میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کی پیروی کی پوری کوشش کی جو ان کے کلام سے صاف ظاہر ہے۔ ان کے کلام کا سب سے بڑا حسن ان کی زبان ہے۔ صفائی کلام اور سلاست زبان کے اعتبار سے عرشؔ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کا کمالِ فن ان کی مثنوی سحر البیان سے نمایاں ہے۔ منظر نگاری شعر و ادب کا ایک انتہائی قیمتی سرمایہ ہے نظیرؔ اور انیسؔ کے علاوہ اس کے نمونے صرف عرشؔ کی مثنوی سحر البیان میں ملتے ہیں۔

عرشؔ کا اپنے والد کی طرح بہت دماغ تھا۔ انہوں نے زندگی آلام و مصائب میں بسر کردی لیکن کبھی کسی بادشاہ، نواب یا رئیس کی شان

میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ فقر و فاقہ برداشت کیا اور زندگی بھر ظاہری شان و شوکت سے بچتے رہے۔ غدر کے ہنگامے میں گھر کا اسباب لٹ جانے کے بعد مفتی گنج سے میاں الماس کے امام باڑے میں اٹھ آئے۔ یہاں بھی سکون میسر نہ آیا تو رکاب گنج میں آ بسے اور وہاں ایک عرصہ قیام کیا۔ آخر اسی محلے میں ۱۸۶۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور رکاب گنج کی دال منڈی میں دفن ہوئے۔

میر کی طرح عرش کے شاگردوں کی تعداد بہت کم ہے۔ عرش کے شاگردوں میں نسب میر ابو طالب، الشیخ میر تراب علی، انجم مرزا بندہ رضا، شیخ فدا علی عیش، میر سجاد حسین فلک، شیخ سرفراز علی قمر اور شیخ محمد جان شاد "پیرو میر" زیادہ مشہور ہوئے۔ صاحب سراپا سخن محسن علی محسن کو بھی عرش سے تلمذ حاصل کرنے کا شرف حاصل ہے۔

عرش صاحب دیوان تھے ان کا دیوان انتقال کے آٹھ سال بعد ۱۸۷۵ء میں ان کے شاگرد رشید شیخ محمد جان شاد المعروف بہ پیرو میر نے بڑی محنت و اہتمام سے مطبع کارنامہ لکھنو میں طبع کرایا تھا جو انجمن ترقی اردو ہند میں محفوظ ہے۔ اسی سے ان کی فکر کا انتخاب حاضر ہے۔

وفورِ ضعف سے دل یار پر نہیں آتا
غمِ فراق میں جینا نظر نہیں آتا

چڑھانے گورِ غریباں پہ کون چادرِ گل
چراغ لے کے کوئی قبر پر نہیں آتا

نگاہِ دیدۂ دل سے نظر نہیں آتا
خیالِ یار بھی دو دو پہر نہیں آتا

یہ روز شام سے ہے صبح تک غم و آزار
کہ شب کو آئینہ بھی اپنے گھر نہیں آتا

غزل

اب دلِ بیمار کی اچھی خبر ملتی نہیں
اے مسیحا نبض بھی دو دو پہر ملتی نہیں

مرتے مرتے اشتیاقِ وصل کم ہو سکتی نہیں
دل سے دل ملتا ہے آنکھوں سے نظر ملتی نہیں

ہے غلط اہلِ زباں کو میٹھی باتوں کا مزا
جسم کو کچھ لذت شیر و شکر ملتی نہیں

خواب میں بھی وہ پری اک رات بھر ملتی نہیں
جان جاتے ہی ہماری جان پر ملتی نہیں

شبِ وصال میں بھی اضطراب رہتا ہے
حجابِ یار کا پردہ حجاب رہتا ہے

عروج خاک میں ملتا ہے تیرہ بختی سے
کہ شب کو زیرِ زمیں آفتاب رہتا ہے

مثالِ برق و شرر یا بہ رنگ نکہتِ گل
کہاں زمانۂ حسن و شباب رہتا ہے

فراقِ یار میں روتا ہوں مثلِ ابر مدام
برنگ برق مجھے آفتاب رہتا ہے

خدا کرے وہ صنم مان لے پیامِ وصال
ہمیشہ عرض سوال و جواب رہتا ہے

ستم ہوا جو مری جان بے قرار ہوئی
غضب ہوا طپشِ دل جو آشکار ہوئی

مزارِ عاشقِ بیکس پہ کون روتا ہے
کبھی نہ شمع وہاں جا کے اشکبار ہوئی

ہزار داغ جنوں دل میں ہو گئے ناسور
شمیم گیسوئے پیچاں جو مشکبار ہوئی

عظیم ٹھٹھوی

میر محمد عظیم الدین ابن سید یار محمد فارسی کے مشہور شاعر اور سندھ کے مورخ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی اور ضیاالدین ضیار کے بھتیجے تھے۔ یہ ۱۷۴۲ء میں ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے۔ فارسی کے باکمال شاعر تھے اور عظیم تخلص کرتے تھے موصوف نے ۱۷۹۴ء میں فارسی میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جو فردوسی کے مشہور شاہنامہ کی تقلید میں تھا۔ ۱۷۹۹ء میں عظیم نے مثنوی "ہیر رانجھا" مرتب کی تھی جسمیں اٹھارہ سو ۱۸۰۰ اشعار تھے۔

عظیم نے فارسی کے علاوہ اردو زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس میں کسی استاد فن سے رہنمائی حاصل نہیں کی۔ ذاتی شوق اور موزونیت کی وجہ سے اردو میں اشعار کہے ہیں۔ زبان اور بندشوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں اردو کے اعلیٰ شاعروں میں سے تھے۔

ڈاکٹر پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ سابق صدر شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی نے دیوانِ عظیم ٹھٹھوی کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس سے عظیم کے کچھ نمونے پیش کئے جا رہے ہیں۔

غزل

سجن جلوہ جمالی مجھ دکھاؤگے تو کیا ہوئیگا — اگر سورج سوں ڈوبے کوں ملاؤگے تو کیا ہوئیگا
تمہارے کنج حسن اوپر زلفاں ناگ کالے ہیں — مجھے ان کالے ناگوں سے کٹاؤگے تو کیا ہوئیگا
بھواں تیری کماں او دو پلک ناوک نظر آئے — نشاں مجھ دل کوں ناوک کا بناؤگے تو کیا ہوئیگا

چمن میں حسن کے تیرے چشماں مست نرگس ہیں — اگر ہم وحش تجھ سے اُڑاؤگے تو کیا ہوئیگا

اس شمع رو کے ہجر میں جلتا تھا جوں پتنگ
اتری مرے نصیب میں عشرت کی رات آج

علی سندھی

میر مراد علی خان نام اور علی تخلص تھا۔ انگریزوں کے سندھ پر قبضے سے پندرہ سال قبل ۱۸۲۸ء میں میر مراد علی خان سندھ کے حکمران تھے نہایت بہادر، اعلیٰ پایہ کے منتظم اور علم پرور حکمراں ہونے کے علاوہ فارسی زبان کے بلند فکر شاعر بھی تھے۔ فارسی میں اپنا دیوان بنام "دیوانِ علی" چھوڑا ہے "طبِ مراد" کے نام سے فارسی میں ایک تصنیف بھی بطور یادگار چھوڑی ہے۔

علی نے اردو زبان کسی سے نہیں سیکھی۔ فطری ذہانت و موزونیت کی وجہ سے اردو زبان میں شعر موزوں کرتے تھے۔ آپ کے اردو کلام میں سے بطور نمونہ ایک غزل درج کی جا رہی ہے۔

غزل

صبحدم یاد مجھے چاکِ گریباں آیا — پھر تصوّر میں مری وہ رُخِ تاباں آیا

سیرِ گلشن میں نظر میری پڑی غنچوں پر — دل میں پھر میرے خیالِ لبِ خنداں آیا

سیرِ بستاں میں میرے سامنے سنبل آیا — دل یہ بولا کہ وہی گیسوئے پیچاں آیا

سرو کو باغ میں دیکھا جو ہم نے علی
یاد مجھ کو وہیں وہ سروِ خراماں آیا

غافل امروہوی

سید سبطِ احمد خلف مولوی سید سبطِ حسن امروہوی نام غافل امروہوی تخلص تھا۔ اگرچہ یہ امروہہ میں پیدا ہوئے مگر ہوش سنبھالنے کے بعد تمام عمر دلّی میں بسر کر دی۔ لال کنواں، دہلی میں محبوب المطابع میں لیتھو گرافک مشین کا پتھر صاف کرنے کا کام کرتے تھے۔ موزوں طبع اور زود گو شاعر تھے۔ اگرچہ خود قطعی حرف ناشناس تھے تاہم شہر کے معزز اور پڑھے لکھے اشخاص نے ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ہوا تھا۔ یہ شاگردوں کا کلام سنتے اور ساتھ ہی زبانی اصلاح کلام بھی کرتے جاتے تھے۔ تعلیم نہ ہونے سے شعری سرمایہ ضائع ہو گیا۔ تلاشِ بسیار کے بعد درج ذیل کلام دستیاب ہوا ہے۔ جو بطورِ نمونہ حاضر ہے۔

غزل

خود حسن ہے خود عشق ہے خود ہوش ربا ہے
اے پیکرِ خاکی تیری تخلیق میں کیا ہے

بیمارِ محبت کو پلا تیغ کا پانی
دنیائے محبت میں یہی آبِ بقا ہے

رہ جاتی ہیں کیوں زیرِ فلک میری دعائیں
کیا اے بتِ کافر ترے کہنے میں خدا ہے

ہم اہلِ محبت ہیں ہماری ہے یہ معراج
تو سامنے ہے سر ترے قدموں پہ جھکا ہے

وہ عشق کو بھی جرم بتاتے ہیں الٰہی ۔ یہ بھی کوئی کم بخت خطاؤں میں خطا ہے

مستوں سے مجھے الفت دیرینہ ہے غافل
مستوں نے ازل میں بھی مرا ساتھ دیا ہے

غنی بنارسی

شیخ عبدالغنی خلف شیخ محمد ایوب اشرف نام، غنی بنارسی تخلص تھا ۱۸۶۳ء میں بنارس میں تولد ہوئے۔ ماں کے سایہ عاطفت سے بچپن ہی میں محروم ہو گئے تھے اس لئے پرورش ننھیال میں ہوئی بیجا لاڈ پیار اور ناسا عد حالات کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ گئے۔ قدرت نے حافظہ ذہانت اور موزونیت بخشے تھے جس نے بنارس کے نامور استاد سخن سے شرف تلمذ حاصل کرنے میں بڑی مدد کی فائز صاحب کی ہدایت سے انہوں نے کچھ پڑھنا لکھنا سیکھا بعد میں کچھ ایسا شوق پیدا ہوا کہ غریب بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے موصوف نے بنارس میں محمود المدارس کی بنیاد ڈالی جس نے ترقی کر کے بعد میں جامعہ اسلامیہ کے نام سے بڑی شہرت حاصل کی۔

حصول معاش کے لئے بنارسی کپڑوں پر نقش نگاری کا عمدہ کام کرتے تھے۔ ان کے مشاغل میں شاعری کے علاوہ کاشتکاری اور شطرنج کھیلنا شامل تھے۔ درمیانے قد کا اکہرا کسرتی بدن کا یہ انسان بڑا رعب دار اور دل موہ لینے والی شخصیت تھی۔

غنی صاحب کا شمار بنارس کے عمائدین اور فائز بنارسی کے نامور شاگردوں میں ہوتا تھا۔ انہیں قیافہ شناسی اور تعبیر خواب دینے میں بڑی شہرت تھی بنارس میں علمی و ادبی سرگرمیاں انہی کے دم سے قائم تھیں۔ وہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ شاعر گر بھی تھے۔

غنی بنارسی نے ۱۹۳۰ء میں وفات پائی اور بنارس کے قبرستان مدنپورہ میں

دفن ہوئے۔ انہی کے مصرعہ سے یہ تاریخ وفات نکلی ہے۔
قصر تمام چلئے یہ منزل تمام ہے۔ نمونۂ کلام حاضر ہے۔
۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء

مجھے روز ہے اس کے غم یونہی دن سے رات کرنا
کبھی چپکے چپکے رونا کبھی دل سے بات کرنا

مری زندگی جو ٹھیری یہ بندگی یہی ہے
کبھی تذکرۂ صفت کا کبھی فکرِ ذات کرنا

یہ غنیؔ کو کیا ہوا ہے کئی دن سے دیکھتے ہیں
نہ کسی کی بات سننا نہ کسی سے بات کرنا

ہائے میری خود کشی پر ان کا کہنا یاس سے
تم سے کچھ عجلت ہوئی کچھ ہم سے نادانی ہوئی

خون کا دعویٰ کر کے ہم کو کیا پشیمانی ہوئی
کہہ دیا پیشِ خدا اس نے نادانی ہوئی

نظم رخصتِ بہار سے چند اشعار

سیرِ چمن کو ہم جو گئے آج اے غنیؔ
دیکھا کہ ایک رنگ نیا آشکار ہے

ہر غنچہ اک خون شدہ دل ہے فراق میں
ہر گُل کا تیغِ ہجر سے سینہ فگار ہے

برگِ شجر میں ہے کفِ افسوس کی روش
بکھرا کے بال سنبلِ تر سوگوار ہے

نہرِ چمن میں پانی کے بدلے بھرے ہیں اشک
شبنم کی آڑ رکھ کے فلک اشکبار ہے

چہرے کا رنگ ہے گُلِ تر کا اُڑا ہوا
مرغِ خزاں نصیب کا دل خار خار ہے

پوچھا جو باغباں سے کہ یہ ماجرا کیا ہے
رو کر کہا رخصتِ فصلِ بہار ہے

رباعی

گر قوم کا ہم فخر کریں بے جا ہے
اصل ایک ہے نسل ایک ہے عبث جھگڑا ہے

سب حضرتِ آدم کی ہیں اولاد غنیؔ
اچھا جو کرے کام، وہی اچھا ہے

اپنے مآلِ کار کو کوئی نہ کچھ سمجھ سکے
موت نہ ہو تو زندگی جینا تمام ہے

بدگمانی نے بڑا کام بگاڑا میرا
کی فغاں غیر نے الزام مرے سر آیا

آنا تھا تمہیں تو پہلے آتے
دیکھو رکھا ہے کیا غنیؔ میں

فداؔ جے پوری

ریاض الدین احمد فدا حسین نام، فداؔ جے پوری تخلص تھا۔ یک چشم تھے۔ کسی بیماری سے ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ شعر گوئی کا حد سے زیادہ شوق تھا۔ معمولی پڑھے لکھے شخص تھے۔ مگر قدرت نے عمدہ ذہن اور تیز حافظہ مرحمت فرمائے تھے۔ جے پور کے نامور عالم دین مولانا مبین صاحب سے فارسی پڑھکر اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی تھی۔ فن سخنوری میں حضرت آگاہ سے شرف تلمذ تھا۔ بہت زود گو اور پُر گو تھے۔ ہندوستانی فلموں کے مشہور نغمہ نگار حسرتؔ جے پوری جنہوں نے فلم دوپٹہ کی بدولت فلمی دنیا میں کافی شہرت پائی فداؔ صاحب کے نواسے تھے۔ اساتذہ سخن کی مجوزہ زمینوں میں طبع آزمائی کا شوق تھا۔ چنانچہ میر تقی میرؔ کی مشہور غزل سہ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ پر اچھی تضمین کہی ہے جسکے دو اشعار ملاحظہ کیجئے سہ

اس کی زلفوں میں کیا اسیر ہوئے
دونوں عالم سے گوشہ گیر ہوئے

پوچھتے کیا ہو تم فداؔ کا حال
اس کو مدت ہوئی فقیر ہوئے

اسی طرح میر انیسؔ کے سلام
پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو

جواب میں۔ سلام کہا ہے۔

ر ہے شجاعت آل محمد عربی
صفیں الٹ گئیں اٹھا جو آستینوں کو

نمونۂ کلام:۔ جگر میں لوٹ رہنا، لگا، دل کے پار ہو جانا
تیرے ناوک سے کوئی سیکھ لے عیار ہو جانا

سہ کسی کی راہ میں مجھکو بھی کیا کیا لطف حاصل تھا
نہ اٹھا سر کہ ہر نقش قدم سجدے کے قابل تھا

قمر جلالوی

سید محمد حسین خلف سید غلام سجاد نام قمر جلالوی تخلص تھا۔ آپ ۱۸۸۷ء میں قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ مدار دروازہ علیگڑھ میں بائسیکلوں کی دوکان تھی۔ قیام پاکستان کے وقت ہجرت کر کے کراچی میں آباد ہو گئے۔ معاش کے لئے پاکستان کوارٹرز نزد زولوجیکل گارڈن میں سائیکلوں ہی کی دکان کر لی تھی۔ بس موٹا جھوٹا لکھنا پڑھنا آتا تھا البتہ بلا کے ذہین اور موضوع طبع تھے۔ فن شاعری کے جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ اس فن میں بھی کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا تھا البتہ امیر مینائی کو روحانی استاد سمجھتے تھے۔ اردو میں ٹکسالی شاعری کے جتنے اساتذہ گزرے ہیں۔ قمر جلالوی انمیں آخری بزرگ خیال کئے جاتے تھے۔ ان کے کلام میں روزمرہ اور محاوروں کی چاشنی کے علاوہ لطافت' شوخی' دلاویزی اور سلاست زبان موجود ہے۔ آپ کراچی میں استاد کے نام سے معروف تھے۔ بلند پایہ شاعر ہونے کے باوجود غرور و تکبر نام کو نہ تھا۔ آپ نے اکیاسی (۸۱) برس کی طویل عمر پائی اور آخر دم تک اردو شاعری کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۶۸ء میں انتقال کے بعد موصوف کے قدردانوں اور شاگردوں نے آپ کا بکھرا ہوا کلام یکجا کیا اور مرتب کر کے شوکت علی اینڈ سنز کراچی کے ذریعہ کتابی شکل میں شائع کرا دیا جس کی علمی و ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔

قمر جلالوی کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ والد سید غلام سجاد صاحب ذوق شخص تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ قمر جلالوی بچپن ہی میں شعر موزوں کرنے لگے تھے شہرت قصبہ جلالی سے نکل کر علیگڑھ' میرٹھ اور دلی تک پہنچ گئی تھی۔ اکثر نوجوان اصلاح سخن کے لئے آپ سے رجوع کرتے تھے۔ مشہور فلمی شاعر شکیل بدایونی بھی اپنی طالب علمی کے زمانہ میں استاد قمر سے اصلاح لیتے تھے۔ شہرت اور قدر و منزلت کے باوجود قمر جلالوی اپنے کلام میں کچھ تشنگی محسوس کرتے تھے۔ اصلاح و تکمیل فن کے لئے کسی استاد کامل سے تعلق پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔ روایت ہے کہ قصبہ جلالی میں اس وقت حدف جلالی ہی کہنہ مشق و مشہور سخنور تھے۔ چنانچہ قمر صاحب نے اصلاح کی غرض سے موصوف کی خدمت میں اپنی ایک

غزل پیش کی جسے انھوں نے لے کر دور پھینک دیا۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ کچھ عرصہ بعد یہی حدف جلالی استاد قمر کے شاگرد ہو گئے۔

قمر جلالوی کے بیشمار شاگرد تھے۔ بھارت میں معروف شاعروں میں شبیر جیلانی، سری کرشن پرشاد بہار، سری راج بہادر اوج، سری راج نرائین کرن سنگھ کرن، محمد غوث غوثی، اثر علیگڑھی اور حدف جلالی وغیرہ قمر جلالوی سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔

پاکستان میں اعجاز رحمانی، عطاء اللہ تجار، نگار بلند شہری، ایاز بجنوری، سرور کانپوری، حافظ بریلوی، پر تم الہ آبادی، توقیر بجنوری، ڈاکٹر یار عباس یاور وغیرہ قمر جلالوی کے زمرہ تلامذہ میں شامل ہیں۔ نمونہ کلام حاضر ہے۔

ے صیاد میں اسیر کہوں کس سے حال دل
صرف ایک تو ہے وہ بھی مرا ہم زبان نہیں

ے کہیں پہ بیٹھ جا کیا دیکھتا ہے بزم ساقی میں
خدا معلوم پہلے کس طرف سے جام آ جائے

ے میں شب وعدہ تصور میں انھیں لے آیا
در پہ بیٹھے ہی رہے غیر نگہباں ہو کر

ے ضبط کرتا ہوں تو گھٹتا ہے قفس میں مرا دم
آہ کرتا ہوں تو صیاد خفا ہوتا ہے

ے کوئی ٹھکانہ ہے صیاد بدگمان کا
قفس میں قید ہوں کاٹے ہیں میرے پر بھی

ے محشر پہ رکھے دیتے ہو دیدار کا وعدہ
صورت بھی قمر کی نہ تمھیں یاد رہے گی

ے وعدہ حشر تو منظور مگر یہ تو کہو
نہ ملے تم تو پکاروں گا تمھیں کیا کہہ کے

تمہیں کس نے بلایا میکشوں سے یہ نہ کہہ ساقی
طبیعت مل گئی ہے ورنہ میخانے بہت سے ہیں

سمجھ کے غیر مجھے اتنے پردہ دار نہ ہو
قطعہ بچے بہت سے بتا دوں جو ناگوار نہ ہو
تمہارے چاند سے رخ کی قسم میں ہی ہوں قمر
جگر کے داغ دکھا دوں جو اعتبار نہ ہو

نعت

تو نے قبل از دو جہاں شان تجلی دیکھی عرش سجتا ہوا بنتی ہوئی دنیا دیکھی
میزباں خالق کونین بنا خود تیرا تیری توقیر سرعرش معلی دیکھی
اے قمر شق ہوا مہتاب پیمبر کے لئے ہم نے دو ہوتے ہوئے چاند کی دنیا دیکھی

سلام

جو چاہتے تھے وہ کوثر پہ انتظام بھی ہے
نجف کا شیشہ بھی ہے کربلا کا جام بھی ہے

درود بھی ہے مناسب اسے سلام بھی ہے
کہ جو نبیؐ کا نواسہ بھی ہے امام بھی ہے

سحر بھی تجھ سے ہے روشن حسین شام بھی ہے
کہ آفتاب بھی ہے تو مہ تمام بھی ہے

یہ کہہ کے چلئے رضواں سے ہم سوئے کوثر
علیؑ کے بادہ کشوں میں ہمارا نام بھی ہے

یہ فکر تھی نہ تھے جب دوش مصطفیٰؐ پہ حسینؑ
بلند عرش سے یارب کوئی مقام بھی ہے

کیفؔ بھوپالی

خواجہ محمد ادریس نام کیفؔ بھوپالی تخلص تھا۔ یہ ۱۹۲۰ء میں ریاست بھوپال میں پیدا ہوئے۔ تعلیم واجبی سی تھی۔ کیف کی والدہ چونکہ خود ایک شاعرہ تھیں اس لئے کیفؔ بھوپالی بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف راغب تھے۔ ابتداء میں جگرؔ مراد آبادی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اکثر جگرؔ صاحب کا کلام ان کی مخصوص طرز میں دوسروں کو سنا کر داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ ۱۹۳۲ء سے خود شعر کہنے لگے۔ پہلے اپنے خالو جناب ذکیؔ وارثی سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں جناب شعریؔ بھوپالی کے تلامذہ میں شامل ہو گئے اور سخت محنت سے فن سخنوری میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا اور بھوپال کی ادبی محفلوں اور مشاعروں پر چھا گئے۔

۱۹۴۵ء میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے اور باغیانہ انقلابی نظمیں کہنے لگے اور اپنے تغزل و ترنم سے خوب نام پیدا کیا۔ ۱۹۴۹ء میں کیفؔ صاحب بھوپال کو خیرباد کہہ کر بمبئی میں سکونت پذیر ہو گئے اور فلمی دنیا میں بحیثیت نغمہ نگار خوب نام پیدا کیا۔ ان کی مشہور نظموں میں پھولدان 'فیصلہ' قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں' سرِ تیغ وہ جہاد فلسطین کے لئے' الیکشن' حکومت نامہ اور شعلۂ حیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نمونہ کلام

دل توڑ کے پیغام قضا دے کے گئے ہیں
کیا خوب محبت کا صلہ دے کے گئے ہیں

اتنی سی خطا پر کہ انہیں پیار سے دیکھا
آنکھوں کو تصور کی سزا دے کے گئے ہیں

جنگل کی طرح رات پہاڑوں کی طرح دن
کیا کیا مری ہستی سے بیا دے کے گئے ہیں

اللہ انہیں نیند مبارک ہو جو مجھ کو
راتوں کو تڑپنے کا مزہ دے کے گئے ہیں۔

پھر کیوں یہ مجھے موت کے آتے ہیں پسینے
اے کیفؔ وہ دامن کو ہوا دے کے گئے ہیں

دلبروں کے بھیس میں پھرتے ہیں چوروں کے گروہ
جاگتے رہو! کہ ان راتوں میں لوٹا جائے گا

ترا میخانہ ہے یا خیرات خانہ' ساقیا
اس طرح ملتا ہے بادہ جیسے بخشا جائے ہے

میکشو! آگے بڑھو! تشنہ لبو آگے بڑھو
اپنا حق مانگا نہیں جاتا ہے چھینا جائے ہے

میں جو باغی ہوں تو کچھ خواہش جنّت بھی نہیں
مرے معبود مگر اتنی تجارت بھی نہیں

وہ بھی سرمایہ پرستوں کی تجوری میں ہے بند
میرے محبوب مرے پاس محبت بھی نہیں

قرض کا نام بھی کیا چیز ہوا کرتا ہے
آج ساقی کی نگاہوں میں شرارت بھی نہیں

کیا محبت کے صلے میں یہ دوعالم لوں گا
یہ دو عالم تو مری خاک کی قیمت بھی نہیں

فلمی زندگی سے قطع تعلق کر کے کیف صاحب بھوپال واپس آگئے تھے۔ انہوں نے بقیہ زندگی اور ساری صلاحیتیں قرآن مجید کی منظوم تفسیر لکھنے میں صرف کر دی۔ پہلا اور دوسرا پارہ مفہوم القرآن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں تقابل کے لئے ایک طرف قرآن مجید کی اصل عبارت اور اس کے ساتھ شاہ عبدالقادرؒ کا مستند ترجمہ دیا ہے۔ دوسری طرف وہ اشعار ہیں جن میں عبارت کے مفہوم کو نظم کیا گیا ہے۔ کیف صاحب کی کوشش لائق ستائش ہے اور اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کوشش کو میزان تنقید پر پرکھ کر اس کی پذیرائی کی جائے۔

کرمؔ تالپور

میر کرم علی خاں نام، کرمؔ تخلص تھا۔ یہ میر صوبدار خاں شہید کے تیسرے صاحبزادے تھے اور ۵ جمادی الثانی ۱۱۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ اپنے بڑے بھائی میر غلام علی خاں کی وفات کے بعد ۱۸۱۱ء میں سندھ کے حکمران بنے۔ یہ سخن سنج اور سخن پرور حکمران تھے۔ تمام ہندوستان بالخصوص سندھ کے معروف شعراء ان کے کرم گستری سے بہرور ہو رہے تھے۔ قدرت نے موزونی طبع عطا کی تھی۔ کرمؔ تخلص کرتے تھے، سندھ کے تالپور حکمرانوں میں پہلے سربر آوردہ شاعر تھے۔ فارسی میں سخن گوئی کرتے تھے۔ ان کا فارسی دیوان "دیوان کرمؔ" کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ کرمؔ صاحب فارسی کے علاوہ اردو میں بھی اشعار کہتے تھے۔ اردو کلام کا انتخاب اخوند محمد بچل انور نے "منتخب لاجواب" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس انتخاب سے کرم صاحب کی ایک غزل بطور نمونہ درج کی جا رہی ہے۔

صبح دم یاد مجھے چاک گریباں آیا — پھر تصور میں مری وہ رخ تاباں آیا

سیر گلشن میں نظر میری پڑی غنچوں پہ — دل میں پھر میرے خیال لب خنداں آیا

سیر بستان میں میرے سامنے سنبل آیا — دل یہ بولا کہ وہی گیسوئے پیچاں آیا

سرو کو باغ میں دیکھا جو کہیں ہم نے کرمؔ
یاد مجھ کو وہیں وہ سرور خراماں آیا

کرمؔ تالپور کے کلام سے موزونیت کے علاوہ بندش اور سلاست زباں صاف ظاہر ہے۔ ان کے اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے موجودہ دور کا کوئی شاعر ہمکلام ہو رہا ہے۔

کلیم جلیسری

کلیم اللہ نام اور کلیمؔ جلیسری تخلص ہے آپ ۱۸۸۷ء میں یوپی کے مشہور قصبہ جلیسر ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے جہاں طوطی ہند حضرت امیر خسروؒ پیدا ہوئے تھے۔ کلیمؔ کے والد رحیم بخش ایک درویش صفت انسان تھے جو ۱۹۰۶ء میں جلیسر کو خیرباد کہہ کر نوشہرہ صوبہ سرحد میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ کلیمؔ کی تعلیم بہت معمولی تھی البتہ شاعری سے دلی لگاؤ تھا۔ اس فن میں منشی سمیع اللہ امیرؔ امروہوی سے تلمذ تھا۔ نہایت زود گو اور پر گو شاعر تھے۔ تقریباً "اسی (۸۰) برس صوبہ سرحد میں گلشن اردو ادب کی آبیاری کی اور اپنے استادانہ فن سے اس خطہ کی ادبی تاریخ میں گرانقدر اضافہ کیا۔

کلیمؔ جلیسری کی نوشہرہ چھاؤنی میں تمباکو کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اسی دکان پر برصغیر کی کئی نامور ہستیاں رونق افروز ہوئیں۔ جن میں علامہ سیمابؔ اکبر آبادی' استاد قمرؔ جلالوی' بیدمؔ وارثی' بسملؔ لکھنوی (منور سلطانہ کے والد) جگرؔ مراد آبادی' ضیاءؔ جعفری' علامہ تاجورؔ نجیب آبادی' ابوالاثر حفیظؔ جالندھری' سردار عبدالرب نشترؔ' نواب فرید خاں' جسٹس سجاد احمد جان' سابق چیف الیکشن کمشنر وغیرہ وغیرہ۔ جگرؔ مراد آبادی جب بھی صوبہ سرحد آتے تو ان کا قیام کلیمؔ جلیسری کے ہاں ہی ہوا کرتا تھا۔ کلیمؔ جلیسری کے کلام میں پرانے اساتذہ کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ آپ کے کلام میں داغؔ کی زبان غالبؔ کا تخیل اور فانیؔ بدایونی کا شعری رنگ نمایاں ہے۔ کلام سہل اور سادہ ہے۔ آپ کیف وارفتگی اور بے خودی کی لہروں میں سامعین کو بہا لے جاتے تھے۔ اپنی غزل کے ایک مطلع میں عسرت و تنگدستی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تلاش کرنے میں وقت کبھی نہیں ہوتی
وہ میرا گھر ہے جہاں روشنی نہیں ہوتی

کلیمؔ جلیسری ایک قلندر صفت انسان تھے۔ تمام عمر درویشانہ گزار دی لیکن کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ ہی اپنے فن کو فروخت کیا۔ خود ہی کہتے ہیں

کلیمؔ زار جن پہ ہم کرم کرتے رہے برسوں
اب ان کے سامنے یہ ہاتھ پھیلائے نہیں جاتے

کلیمؔ جلسوی عوام الناس کے شاعر تھے۔ کلام سے ہر استعداد کا آدمی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ کلام میں ایک خاص لطف ہے جو زبان اور بیان کی برجستگی سے پیدا ہوتا ہے۔ آپ کو فی البدیہہ اشعار کہنے کا ملکہ حاصل ہے کئی موقعوں پر قدرت کی اس بخشش کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ایک دفعہ جہانزیب کالج سوات میں کل پاکستان مشاعرہ تھا۔ عبدالحمید عدم صدر مشاعرہ اور پروفیسر شوکت واسطی مشاعرہ کے روح رواں تھے۔ شروع کے شعراء کو تو کالج کے طلباء نے پتھروں، آلوؤں اور ٹماٹروں سے اپنی کرسیوں کی راہ دکھائی۔ بگڑتی صورتحال دیکھ کر منور سلطانہ کو اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔ محترمہ نے چار عدد غزلیں ترنم سے پڑھیں اور کالج کے طلباء کو قابو کر لیا۔ اس کے فوری بعد کلیمؔ جلسوی کو اپنا کلام سنانے کی دعوت دی گئی۔ کلیمؔ جلسوی نے مشاعرہ میں ہلڑبازی کے دوران دو عدد قطعات تیار کر لئے تھے۔ ایک کالج کے طلباء پر تھا اور دوسرا منور سلطانہ پر۔ دونوں قطعات پیش خدمت ہیں۔ طلباء کو مخاطب کر کے کہا ہے

تم نہ غیروں کے رہو اور نہ غم خواروں کے
پھر نہ کوچوں کے رہو اور نہ بازاروں کے

کس طرح جیتے ہیں جینے کا مزہ آ جائے
ہاتھ آجائیں کہیں آپ جو فنکاروں کے

یہ قطعہ سن کر طلباء ایسے خاموش ہو گئے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ دوسرا قطعہ جو منور سلطانہ کے متعلق تھا حسب ذیل ہے۔

پر تو ہیں طاقت پرواز کہاں سے لاؤں
شعر میں سوز تو ہے ساز کہاں سے لاؤں

میں غزل تم کو ترنم میں سناتا لیکن
اب جوانی کے وہ انداز کہاں سے لاؤں

کلیمؔ جلیسری نے اشعار و قطعات کے علاوہ متعدد نعتیں اور نظمیں بھی کہیں ہیں۔ آپ کی پہلی نعت "پیسہ اخبار" لاہور میں ۲۲ مارچ ۱۹۰۵ء کو شائع ہوئی تھی۔ اس کے دو اشعار تحریر کرتا ہوں۔

منور کیوں نہ ہو صورت غلامان محمدؐ کی
چمک ہے ان کی پیشانی پہ جب شان محمدؐ کی

اگر مردے کو چاہیں تو جلا دیں ایک ٹھوکر سے
خبر کیا اے مسیح تم کو غلامانِ محمدؐ کی

کلیمؔ جلیسری کی دو غزلیں شوکتؔ واسطی کے شکریہ کے ساتھ حاضر ہیں۔

کانوں پہ ہاتھ رکھ لئے اہلِ مزار نے
نالے کئے ہیں آج یہ کس بے قرار نے

تربت لپیٹ لی ہے مری اہلِ زار نے
سر کو بھی گل کھلائے دلِ داغدار نے

کیا کیا فریب مجھ کو دیئے انتظار نے
لایا طرح طرح سے تصور میں سامنے

پھر آگ آ کے دل میں لگا دی بہار نے
مدت ہوئی تھی ترک کئے مجھ کو مے کشی

سب کچھ بھلا دیا ہے غمِ روزگار نے
کیسی نماز، روزہ، کہاں بندگی کدھر

آ گیا بڑھ کر قدم لئے مری خاکِ مزار نے
یہ کون آج گورِ غریباں پہ

کس نے کلیمؔ زار کو بے خود بنا دیا
جاتے ہیں روز طور پہ کس کو پکارنے

غزل

جو دیکھیں آئینہ تو دیر حیرانی نہیں جاتی
اب اپنی ہم سے صورت آپ پہچانی نہیں جاتی

بہت چھانی جہاں کی خاک اب چھانی نہیں جاتی
نہ جائے جو مرے گھر سے پریشانی نہیں جاتی

وہی تصویر کل میں نے بنائی اپنے ہاتھوں سے
وہی تصویر مجھ سے آج پہچانی نہیں جاتی

نہ وہ ہم ہیں نہ وہ دل ہے نہ وہ عزم جواں اپنا
جو پہلے ٹھان لیتے تھے وہ اب ٹھانی نہیں جاتی

خدا جانے عقیدت ہے کہ ضد ہے میرے گلشن سے
خزاں آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

بری عادت کا پڑ جانا بہت آسان ہے لیکن
یہ جاتی ہے تو مشکل سے بآسانی نہیں جاتی

تمہاری بات پر سو جان سے سب جان دیتے ہیں
ہماری بات جو کہہ دیں کہیں مانی نہیں جاتی

مصیبت یوں تو ہر اک آکے ٹل جاتی ہے دنیا کی
تعجب ہے مرے گھر سے پریشانی نہیں جاتی

سمجھنا غیر کی فطرت کلیمؔ زار مشکل ہے
حقیقت آپ سے اپنی تو پہچانی نہیں جاتی

گہرؔ گورکھپوری

ایشوری پرشاد نام اور گہرؔ تخلص تھا۔ یہ گورکھپور کے بڑے زمیندار بابو منگل پرشاد سرور استو عرف چھنی لال کے ہاں ۱۹۱۱ء میں تولد ہوئے۔ ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد جارج اسلامیہ اسکول گورکھپور میں پڑھنے بٹھائے گئے مگر تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ انھیں بچپن ہی میں شاعری کا چسکا پڑ گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں مرزا عبدالمجید شاگرد جلالؔ لکھنوی سے تلمذ حاصل کرکے باقاعدہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ بہت سخن فہم اور باکمال شخصیت تھی۔ تعلیمی کمی کو بزرگوں اور صاحبان علم و فن کی صحبتوں نے پورا کر دیا تھا۔ انھیں اساتذہ سخن کے لاتعداد اشعار ازبر تھے۔ محنت اور کثرت مشق سے زبان اردو پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ کلام رنگینی، دلکشی اور فنی پختگی کا نمونہ ہے۔

گوہر صاحب کا کلام "سنگ گوہر" کے نام سے ۱۹۷۲ء میں چھپا تھا۔ جناب فراق گورکھپوری نے اس کا پیش لفظ اور ڈاکٹر سلام سندیلوی نے مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اس میں غزلیں، نظمیں، قطعات، رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔

۲۲۔ ۱۹۷۲ء میں گہرؔ صاحب پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ سات سال ضلع ہسپتال گورکھپور میں زیر علاج رہ کر ۱۵ جون ۱۹۷۹ء کو انتقال کر گئے۔

نمونۂ کلام

کچھ دن تو اور ساتھ دے اے اضطراب شوق
دنیا یہی کہے گی کہ گھبرا کے رہ گئے

مجھے خیال یہ گزرا کہ آ گیا کوئی
جو شام ہجر میں جھونکے کبھی ہوا کے چلے

اس کی مجبوریاں نہ پوچھ گہرؔ
جو خوشی میں بھی مسکرا نہ سکے

ماہر دہلوی

ابوالکمال حمید اللہ بیگ خلف سردار مرزا نام 'ماہر' تخلص تھا۔ یہ شفاء الملک حکیم محمود علی خاں ماہر دہلوی کے ہمعصر تھے اور دہلی میں محلہ تیراہا بیرم خاں میں سکونت رکھتے تھے۔ بچپن میں خطنہ میں خون حد سے زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ شہر میں نابینا شاعر کے نام سے مشہور تھے۔ بعوض چشم ظاہر بیں کے اللہ نے دیدہ دل روشن کر دیا تھا۔ اسی حالت نابینائی میں مدرسہ حسینیہ کے نامور عالم مولانا محمد ابراہیم سے قرآن مجید اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔

اس دور میں دہلی اردو شاعری کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ گلی گلی شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ماہر صاحب کو شاعری سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ بغیر کسی استاد فن کی رہنمائی کے شعر موزوں کرنے لگے۔ مولانا راسخ دہلوی سے انہیں گہری عقیدت تھی۔ اس لئے موصوف سے مشورہ سخن کر لیا کرتے تھے۔ نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کی حویلی میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ غزل اور نظم دونوں خوب کہتے تھے۔ زبان سلیس' بامحاورہ اور اسلوب بیان نہایت موثر تھا۔ اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے۔ موزونیت کے علاوہ حافظہ بلا کا تھا۔ کلام سناتے ہوئے کیا مجال ہے کہ کہیں سے بھول جائیں۔ معذوری کی وجہ سے بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ کچھ کلام موصوف کے نواسے فرحان الرحمٰن کے توسط سے حاصل ہوا ہے جو ناظرین کی دعوت طبع کے لئے پیش کرتا ہوں۔

درد بھی دل کو بامزہ بخشا دل بھی درد آشنا دیا تو نے

بے غرض جو ملا' ملا مجھ کو بے طلب جو دیا' دیا تو نے

زخم بھرنے نہ پائے تھے دل کے اور چرکا لگا دیا تو نے

چشم مخمور میں تیرے صدقے مست و بیخود بنا دیا تو نے

ماہر درد تھا فقط ماہرؔ
ماہر دل بنا دیا تو نے

ماہرؔ صاحب کی ایک اور غزل ملاحظہ کیجئے:۔

رہے جو شیشہ کے اندر بند کیا وہ پری
جو ہو حجاب میں مستور کیا وہ جلوہ گری

تو قدرے محبت عشق دوست کیا جانے
متاعِ حسن خبر ہے کمال بے خبری

یہ نقص جذبہ جنوں ہی نہ ہو کہ وہ غافل
وگرنہ جذب و جنوں کی تیری یہ بے اثری

شہید خنجر عشق وفا تعال اللہ
ہنوز یاد ہے دنیا کو تیری بے جگری

حیاجِ درد سے محروم دل بھی آنکھیں بھی
نہ آہ نیم شبی ہے نہ گریہ سحری

طلسم خواب گراں کے اسیر آنکھیں کھول
سنا رہا ہے موذن ترانہ سحری

ایک دوسری غزل کے چند اشعار حاضر ہیں:۔

آرزوئے دیدِ حسن دوجہاں رکھتا ہوں میں
دل جواں رکھتا ہوں نظریں بھی جواں رکھتا ہوں میں

حسن آ تو بے تکلف آ محبت تو بھی آ
دل میں گنجائش بقدر دوجہاں رکھتا ہوں میں

ہاں گناہوں میں ہوں آلودہ میں سرتا پا
کیا یہ کم ہے دل میں بخشش کا گماں رکھتا ہوں میں

آسماں کیا عرش جھک جاتا تھا اس کے سامنے
ہاں مگر ماہرؔ وہ دل ہی اب کہاں رکھتا ہوں میں

دوسری جنگ عظیم نے دنیا کا امن تہ و بالا کر دیا تھا۔ تمام قوموں نے غاصبوں سے خود بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ شعراء بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ماہرؔ صاحب نے "ہمارا وطن" کے نام سے نظم کہی تھی جو بہت پسند کی گئی۔ نظم کا ایک بند درج ہے۔

نشاط جہاں اس کے ایک ایک چمن ہے
تو حوروں کا دل ہر سمن یا سمن ہے
ہمیں سب سے بڑھ کر اسی کی لگن ہے
ہمارا وطن جگ سے پیارا وطن ہے

اگر غیر آتے ہیں اس کو مٹانے تو جاتے ہیں ان سب کا خون بہانے
یہ نعرہ لگاتے یہ نغمہ سناتے ہمارا وطن جگ سے پیارا وطن ہے

نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تم ہی تو ہو روح گلستان وطن تمہارے دم سے ہے آن وطن شان وطن
ہاں خدا رکھے تم ہی تو ہو نگہبان وطن آجکل خطرہ میں آتی ہے نظر جان وطن

نوجوانان وطن اے نوجوانان وطن

عدوئے زرد رو آنے کو ہے ہوشیار ہو جاؤ وطن اپنا بچانے کے لئے تیار ہو جاؤ
بتا دو دشمنان زرد رو اور پست قامت کو کہ ہاں دوزخ میں جلنے کے لئے تیار ہو جاؤ
اگر سیل بلا بن کر حریفان وطن آئیں تو تم مضبوط تر فولاد کی دیوار ہو جاؤ

عدو آئے اگر ماہرؔ بلائے ناگہاں بن کر
تو تم دست قضا کا پنجۂ خونخوار ہو جاؤ

☆ ☆ ☆

ہم بھی زور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ
قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہو گیا

ناصح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ
تیرا ہی ذکر تھا کہ میں لاچار ہو گیا

اے ہمنشیں وہ حضرت ماہرؔ نہ ہوں کہیں
اک پارسا سنا ہے کہ میخوار ہو گیا

☆ ☆ ☆

ہوں وہ دیوانہ کہ روتا ہے مرے احوال پہ
چشم حسرت سے ہر اک حلقہ مری زنجیر کا

کھینچ لے اے چارہ گر پہلو سے میرے دل سمیت
ورنہ مشکل ہے نکلنا یوں تو اس کے تیر کا

☆ ☆ ☆

ہر ایک قدم پہ ہیں سو سو قیامتیں برپا
نہیں وہ چال کہ فتنہ ہے اک زمانہ کا

سمجھ ہی الٹی ہے دیوانگان الفت کی
کہ دل کے جانے پہ رکھتے ہیں نام آنے کا

ترے تو لطف سے بھی جان کانپتی ہے کہ یار
نہیں ہے برق سے کم طور مسکرانے کا

نہ ربط ایک سا ہر ایک سے رکھو ماہرؔ
ذرا تو دیکھو کہ کیا ڈھنگ ہے زمانہ کا

؎ خدا ہی جانے اثر تھا یہ کس کی شوخی کا
کہ دل میں ہوتی تھی رہ رہ کے بیقراری رات

؎ بولے تو تھے پہ اس کی حاضر جوابیوں سے
ناچار چپکا رہنا آخر پڑا ہمیں کو

؎ پہنچو غبار بن کے تو دامن کو دے جھٹک
محنت کسی کی میری طرح رائیگاں نہ ہو

؎ بگڑ کر بیٹھنا اس کا بناؤ ہے گویا
ہر ایک بات میں خوبی ہے خوشنما کے لئے

؎ میں ہوں اسیر مجھ کو رہائی کی دے نوید
ورنہ یوں ہی بہار سے کیا باغباں مجھے

؎ صحرا کو لے چلے ہمیں وحشت کے ولولے
دیکھی نہ راہ آمد فصلِ بہار کی

maablib.org

منوّر سنبھلی

منوّر حسین نام منوّر تخلص۔ ساکن کورٹ غربی سنبھل ضلع مراد آباد۔ پیشے کے لحاظ سے معمار تھے۔ محنت اور خوش اخلاقی سے ترقی کرکے گورنمنٹ ٹھیکیدار ہوگئے اور کافی دولت و مرتبہ پیدا کیا۔ معمولی لیاقت کے آدمی تھے لیکن سخت محنت و کوشش سے شعرگوئی میں خاصہ نام پیدا کر لیا تھا۔ شاعری میں سنبھل کے مشہور وکیل و شاعر عبدالغفور خاں غفور سے تلمذ حاصل تھا۔ تقریباً ہر صنف سخن میں کوشش کی ہے البتہ نعت گوئی سے زیادہ شغف و دلچسپی تھی۔ نمونہ کلام پیش خدمت ہے۔

غزل

لطف کچھ ان کے تصوّر کا مجھے حاصل نہیں
کیا ابھی دل میں مرے وہ جذبہ کامل نہیں

اب جنون عشق خود ہے چارہ ساز دردوغم
اب شب فرقت بسر ہونا کوئی مشکل نہیں

شوق بے پایاں کا طوفان اور ہوگا موجزن
یہ تو اچھا ہے کہ بحر عشق میں ساحل نہیں

لَو سوزاں ہی سہی روشن نہیں گرداب دل
سوز الفت میں جو حاصل ہے وہ لاحاصل نہیں

منزل الفت میں اب کس کو بتاؤں رہنما
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کوئی رہبر منزل نہیں

تشنہ جام شہادت ہی منوّر رہ گیا
کیا بجھائے پیاس اب خنجر قاتل مجھے

نعت

کل انبیاء میں شاہ رسولاں تم ہی تو ہو
اس سروری کے واسطے شایاں تم ہی تو ہو

کیا ہو رہی ہیں بزم تخیل میں رونقیں
زینت ہے جس سے دل کی، وہ ارماں تم ہی تو ہو

وہ تم ہو جس سے فخر ہے آدم کی ذات کو
مائل خدا ہے جس پہ وہ انساں تم ہی تو ہو

حسن ضیاء رخ سے دوعالم ہیں جلوہ گر
دونوں جہاں کے ماہ درخشاں تم ہی تو ہو

تم سے مدد نہ چاہیں تو کس سے ہم کہیں
محبوب حق پناہ مسلماں تم ہی تو ہو

جس قدم سے عرش بریں جھومنے لگا
معراج میں خدا کے وہ مہماں تم ہی تو ہو

رخ سے تمہارے ہے گل جنت میں تازگی
وجہ بہار گلشن رضواں تم ہی تو ہو

بیچارگی میں کون منور کے رفیق
مشکل میں دستگیر غریباں تم ہی تو ہو

قطعہ

حشر تک بھی نہ اٹھے سر ترے سودائی کا
لطف تو جب ہے ترے در پہ جبیں سائی کا
جلوہ حسن کے پرتو سے منور دل ہے
نام روشن ہے جہاں میں ترے شیدائی کا

مخفیؔ رامپوری

محمد یاسین نام' مخفیؔ تخلص تھا۔ یہ ریاست رام پور کے رہنے والے تھے اور تعلیم سے قطعی بے بہرہ تھے۔ ماں باپ مرفہ الحال نہ تھے۔ یہ خود بھی تعلیم سے رغبت نہ رکھتے تھے اس لئے دولت تعلیم سے محروم رہ گئے۔ قدرت نے حافظہ کے ساتھ موزونیت عطا کی تھی۔ دیندار شخص تھے' اچھے نعت گو شاعر سمجھے جاتے تھے۔ بہ اعتبار عمران کا شمار قدیم شعراء میں ہوتا تھا۔ یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ابتدائے شاعری سے اب تک جتنے اشعار کہے تھے وہ مع اصلاح سب یاد تھے۔ بہت پر گو اور زود گو تھے۔ ان کی قادر الکلامی کا مندرجہ ذیل کلام سے اظہار ہوتا ہے۔

نعت

حق کے پیارے حق کے دلبر ہیں محمد مصطفیٰ ۔۔۔ اور زمانہ بھر کے سرور ہیں محمد مصطفیٰ

میری آنکھوں سے ذرا دیکھے کوئی انکا جمال ۔۔۔ ماہ و انجم سے فزوں تر ہیں محمد مصطفیٰ

قافلہ ایمان والوں کا نہ بھٹکے گا کبھی ۔۔۔ ہر قدم پہ ان کے رہبر ہیں محمد مصطفیٰ

حشر کے دن کا کوئی خطرہ نہیں مخفیؔ مجھے
میرے حامی روز محشر ہیں محمد مصطفیٰ

ایک دوسری نعت کے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجئے۔

سما گئے ہیں وہ دھڑکنوں میں تڑپ مری رائیگاں نہیں ہے
اب ان کے جلوے ہیں اور میں ہوں کوئی میرے درمیاں نہیں ہے

شباب پہ ہو جو ناز تم کو شباب کی عمر بھلا کیا
گلوں کا انجام دیکھو آؤ تمہیں خیال خزاں نہیں ہے

کرو بھروسہ نہ اس پہ مخفیؔ کرے گی اک روز بیوفائی
لگاؤ دل کو نہ زندگی سے یہ زندگی جاوداں نہیں ہے

میرا جی

میرا جی کا اصل نام محمد ثناء اللہ ڈار تھا۔ لاہور کے مارسن کالج کے پروفیسر سین کی لڑکی "میرا سین" کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنا نام "میرا جی" رکھ لیا تھا اور اسی نام سے معروف ہوئے۔

میرا جی کے باپ لاہور میں برج انسپکٹر تھے۔ نہایت پابند شرع اور پانچوں وقت کے نمازی۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ساری زندگی انجمن حمایت الاسلام کی خدمت میں گزار دی۔ موصوف کے تین صاحبزادے تھے۔ ثناء اللہ ڈار' انعام اللہ نامی اور اکرام اللہ کامی۔ باپ نے تینوں کو تعلیم دلانے کی پوری کوشش کی مگر ان میں کسی ایک نے بھی چند جماعتوں سے آگے پڑھ کر نہیں دیا۔ سب بھائی ماں باپ کے ساتھ مزنگ میں رہتے تھے۔ میرا جی سب سے بڑے لڑکے تھے۔ اسکول سے طبیعت اچاٹ ہونے کے بعد میرا جی نے بہت چاہا کہ بڑا آدمی بن جائے اور کہیں سے مفت کی بہت سی دولت ہاتھ لگ جائے تاکہ میرا سین کو حاصل کر سکے۔ دولتمندوں کو دیکھ کر کلستے مگر ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے البتہ اپنی صورت اور سیرت دونوں ضرور خراب کر لیں۔ دنیا کی تکلیفوں اور غموں کو دور کرنے کے لئے کثرت سے شراب پینے لگے اور وہ بھی دیسی ٹھرا۔ اس وجہ سے عجیب و غریب حرکتیں کرتے تھے۔ روس کے دیوانے راہب "راسپوٹین" کی طرح غلاظت پسند تھے۔ ساری زندگی نفسیاتی الجھنوں کا مجموعہ تھی۔

جملہ خرافات کے باوجود میرا جی کی شخصیت بڑی پر کشش تھی۔ قدرت نے بہت سی خوبیوں سے نوازا بھی تھا۔ موزوں طبع ہونے کے ساتھ ہی زودگو اور پرگو بھی تھے۔ ابتدائی شاعری میں جو گندگی کا عنصر تھا وہ ۱۹۴۲ء کے بعد نکل گیا تھا اور کلام میں سنجیدگی آ گئی تھی۔ شعر بھی صاف کہنے لگے تھے ہر شعر ان کی شخصیت اور انداز خیال کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے۔ میرا جی اپنے رسیلے گیتوں' کنایاتی نظموں اور بے قافیہ اشعار کی ابہامی کیفیتوں کے اعتبار سے اردو شعری ادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں بے قافیہ نظم اور آزاد نظم کا

فروغ اور پیچیدہ تاثرات' شدید جذبات اور نازک محسوسات کا اظہار بڑی حد تک میراجی کے شعری تجربات کا مرہون منت ہے۔

میراجی کی نظموں' غزلوں اور گیتوں سے انتخاب درج ذیل ہے۔

انتخاب

میں تھکا ماندہ مسافر ہوں چلا جاؤں گا
اک گھڑی راہ میں تم مجھ کو بسر کرنے دو
جانی پہچانی ہر اک بات ہوا کرتی ہے
جانی پہچانی ہر اک بات سے کیا رغبت ہو

☆ ☆ ☆

پل کا جادو ہے' انوکھا جادو
نت نئی باتوں کو لے آتا ہے
ایک پل شرم کا دشمن ہے کہ جیسے کبھی خلوت سے کوئی دوشیزہ
پیرہن سیج پہ رکھ دے ور استادہ سے باہر آئے
اور باہر ہو ہجوم
اپنے حلقوں سے نکلتی ہوئی آنکھوں کا ہجوم

☆ ☆ ☆

چل چلاؤ

طوفان کو چنچل دیکھ ڈری' اکاش کی گنگا دودھ بھری
اور چاند چھپا تارے سوئے' طوفان مٹا ہر بات گئی

دل بھول گیا پہلی پوجا' من مندر کی مورت ٹوٹی

دن لایا باتیں انجانی' پھر دن بھی نیا اور رات نئی
پیتم بھی نئی' پریمی بھی نیا' سکھ بیج نئی' ہر بات نئی

ہر منظر ہر انسان کا دیا اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے پل بیتا سب مٹ جائے گا

مجھے گھر یاد آتا ہے

حیات مختصر سب کی کٹی جاتی ہے اور میں بھی
ہر ایک کو دیکھتا ہوں مسکراتا ہے کہ ہنستا ہے
کوئی ہنستا نظر آئے کوئی روتا نظر آئے
میں سب کو دیکھتا ہوں دیکھ کر خاموش ہوتا ہوں
مجھے ساحل نہیں ملتا

زندگی

جب نیندوں سے جاگیں گے
اور سپنوں کو تیاگیں گے

تب کیسی حالت ہوگی
چنتا یا راحت ہوگی

اس کی فکر نہیں مجھ کو
جو بھی ہے وہ نہیں مجھ کو

ہست دکھائی دیتا ہے
میں نے بس یہ سمجھا ہے

جیون سندر سپنا ہے
وہ پل کو یہ اپنا ہے

رخصت

میری آنکھوں میں ہیں بازو اپنے
جیسے اک پیڑ کے ٹہنے ہوں کہیں پھیلے ہوئے

جن پہ آغاز کا نشیمن کبھی بنتا ہی نہ ہو
سوکھتے جاتے ہوں ٹہنے غم محرومی سے

منیرؔ دہلوی

وجیہ الدین نام منیرؔ تخلص تھا۔ باپ شاہ نصیرؔ تو تھوڑے بہت لکھے پڑھے بھی تھے مگر یہ لاڈ پیار اور غفلت کی وجہ سے امّی محض رہ گئے۔ شاعری چونکہ ورثہ میں ملی تھی اس لئے موزوں سخن تھے۔ نہایت خوبصورت جوان تھے۔ ۱۲۷۸ھ میں انتقال ہوا اور دہلی ہی میں آسودہ خاک ہوئے۔

نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

ے فرہاد سی کہتی تھی تیشہ کی زبان ہر دم
مغموم نہ ہو ناداں سنگ آمد و سخت آمد

ے اس باغ جہاں میں کبھی پھولے نہ پھلے ہم
جوں نخل چنار اپنے ہی آتش میں جلے ہم

ے بیان جور خوباں کل ترا بیمار غم سن کر
یہ کہہ کر مر گیا ایک آہ بھر ایسے نہوتے تھے

ے خون کی دھار میں یہ چھٹیں دل سے دل فگاروں کے
رو گئے سن کر کھڑے ہو گئے فواروں کے

ے غضب چہرہ پایا ستم آن پائی
تجھے پائے تصویر کیا جان پائی

میکش غازی پوری

اکبر حسین خلف احمد اللہ خاں نام اور میکش تخلص تھا۔ یہ یوپی (ہندوستان) کے غازی پور میں ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے اور زندگی کی پچاس بہاریں لوٹ کر ۱۹۷۶ء میں راہی ملک عدم ہو گئے۔ یہ معمولی لیاقت کے آدمی تھے۔ ناساعد حالات کی بناء پر تعلیم کا سلسلہ چند جماعتوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ تاہم ذاتی کوششوں سے علمی استعداد میں اضافہ کرتے رہے۔

بچپن میں شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور باقاعدہ شعر کہنے لگے تھے۔ معروف شاعر سروش مچھلی شہری سے شرفِ تلمذ بھی حاصل کر لیا تھا۔ چار پانچ سال کی مشقِ سخن کے بعد آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کر کے اہلِ فن سے دادِ تحسین حاصل کرنے لگے تھے۔ تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر نظموں کی طرف خاص میلان تھا۔ بہت پیاری نظمیں کہتے تھے۔ کلام مذہبی نظموں کی صورت میں آٹھ تو مطبوعات بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ میکش نے "نہج البلاغہ" کا اردو منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جسے اہلِ علم نے بہت پسند کیا ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

غزل

غمِ جاناں، غمِ دوراں کہ غمِ جاں پہلے
کون بہلائے تجھے اے دلِ ناداں پہلے

رقص کرتا ہوا زنجیر کی جھنکاروں پہ
تیرا دیوانہ ہوا داخلِ زنداں پہلے

میرا دامن بھی نہ رہ جائے گا محرومِ سکوں
تم تو سلجھاؤ مگر زلفِ پریشاں پہلے

روشنی کا جب اٹھایا گیا گلشن میں سوال
گھر جلا کر بھی کیا ہم نے چراغاں پہلے

آج بازار میں نایاب سہی جنس وفا
یہ گراں شے بھی گراں ہو کے بھی ارزاں پہلے

اعتبار آئے گا کس کو جو کہوں بھی مےکشی
تھا چمن اپنا بھی فردوس بداماں پہلے

☆ ☆ ☆

غزل کے چند اشعار

قصہ ہستی کہیں یا عشق کا افسانہ ہم ۔۔۔ اب غم دنیا سنائیں یا غم جانانہ ہم

میکدہ ویران، سبو خالی، مے و مینا اداس ۔۔۔ آ لپٹ کر تجھ سے روئیں ساقی میخانہ ہم

بزم میں دونوں طرف ہیں آگ کی دو لویلند ۔۔۔ اب کریں کیا امتیاز شعلہ و پروانہ ہم

☆ ☆ ☆

غم کی نوید درد کا پیغام بھی دیا ۔۔۔ ٹوٹے ہوئے سہاروں نے آرام بھی دیا

ہم سے تو کچھ بھی نہ ہو سکا احتیاط میں ۔۔۔ تم نے تو خیر عشق پہ الزام بھی دیا

ایسا نہیں کہ صرف ملی ہیں اذیتیں ۔۔۔ دیوانگی نے کچھ مجھے آرام بھی دیا

راضی نہ ان سے ترک مراسم پہ دل ہوا ۔۔۔ میں نے اگر حوالۂ انجام بھی دیا

پہنچایا حق بیانی نے مےکش صلیب تک ۔۔۔ دنیا نے ہم کو زہر بھرا جام بھی دیا

☆ ☆ ☆

نعتیہ قصیدے سے چند اشعار

اللہ اللہ آمنہ کے گود کی پاکیزگی
یہ ازل سے نور خالق کی امانت دار ہے

دیکھتے ہیں ہو کے خوش بیٹے کو عبدالمطلبؑ
گود میں وہ پھول ہے جو حاصل گلزار ہے

ہم ابوطالب کی ان میٹھی نگاہوں کے نثار
جن میں بیٹے سے زیادہ مصطفیٰؐ کا پیار ہے

آؤ سر کے بل چلیں مخلص سلامی کے لئے
جو شفیع روز محشر ہے، یہی سرکارؐ ہے

maablib.org

نصیر دہلوی

شاہ نصیر الدین خلف شاہ غریب نام اور نصیرؔ تخلص تھا۔ سیاہ رنگ ہونے کی وجہ سے دلّی میں میاں کلّو کے نام سے مشہور تھے۔ ہر چند باپ نے تعلیم دلانے کی بہت کوشش کی مگر انہیں سوائے شاعری کے اور کچھ نہ آیا۔ اس فن میں شاہ محمدی مائلؔ کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہوئے جو استاد ذوقؔ کے شاگرد تھے اور جن کا مزاج فقر و تصوف کی طرف زیادہ راغب تھا۔ شاہ نصیرؔ نے فطری موزونیت، محنت، مشق سخن اور استاد کی توجہ سے جلد شہرت حاصل کرلی۔ فی البدیہہ کہنے میں مشاق تھے۔ باوجود کم علمی کے ان کی طبیعت شعر سے ایسی مناسبت رکھتی تھی کہ بڑے بڑے ذی استعداد اور مشاق شاعر مشاعروں میں ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔

شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ تھا جو خود بھی اچھے شاعر تھے اور شعراء کو بڑے بڑے اعزاز و اکرام سے نوازتے تھے۔ استاد ذوقؔ اور شاہ محمدی مائلؔ کے توسط سے شاہ نصیرؔ کی دربار تک رسائی ہوئی۔ شعراء دربار کے ساتھ یہ بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ دادِ تحسین کے علاوہ خوب خوب اعزاز و انعام سے نوازے جاتے تھے۔ دربار کے علاوہ تمام دلّی میں ان کی قدر و منزلت تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب دلّی میں انگریزی عملداری قائم ہوگئی تو شاہ نصیرؔ نے حیدر آباد دکن کا سفر اختیار کیا۔ یہاں دیوان چندو لال نے بہت عزت فزائی کی اور اعزازات و انعامات سے خوب خوب نوازا۔ آخر حیدر آباد ہی میں جہان فانی سے رحلت کی اور قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں سپرد خاک ہوئے۔ انتخاب کلام حاضر ہے۔

ایک دن مجھ سے یہ اس پردہ نشین نے پوچھا
کنج تنہائی میں گر تجھ سے نہ پردہ کرتا

تو مجھے عاشق بیتاب اکیلا پا کر
کچ بتا تو کہ مرے ساتھ بھلا کیا کرتا

سن کے یہ ہمنساں میں نے کہا یہ اس سے
میں کسی بات کا ہرگز نہ ارادہ کرتا

صفحۂ دل سے ترے حرف گمان بد کو
یک قلم دور ہاں شکل نکارا کرتا

یعنی آئینہ کی مانند بہ آئین صفا
دیکھتا میں تجھے اور تو مجھے دیکھا کرتا

غزل

کیا ہوا اگر چشم تر سے خون ٹپک کر رہ گیا
بادہ گلگوں کا ساغر تھا چھلک کر رہ گیا

دل سواد زلف میں ڈھونڈے ہے رستہ بانک کا
راہ جو بھولا مسافر سو بھٹک کر رہ گیا

سینکڑوں مرمر گئے ہیں عشق کے ہاتھوں سے آہ
میں بھی کیا پتھر سے اپنا سر پٹک کر رہ گیا

ہم وہاں پہنچے کبھی کے منزل مقصود کو
دو قدم چلتے ہی میں تھک کر رہ گیا

تاب میں باقی کی موتی کی نہیں کیا زلف میں
اے دل آشفتہ سچ کہہ کیوں تو بک کر رہ گیا

سرزمین شام سے تارا گرا تھا ٹوٹ کر
یا اندھیری رات میں جگنو چمک کر رہ گیا

طرفۃ العین اس کے مژگاں کے تصور سے نصیر
خار سا آنکھوں میں میری کچھ کھٹک کر رہ گیا

شاہ نصیر کی ایک اور غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

دیکھ تو یار بادہ کش میں نے یہ کام کیا کیا
دے کے کباب دل تجھے حق نمک ادا کیا

زخم جگر سے دم بدم کب نہیں خون بہا کیا
تو بھی نہ میں نے آپ سے دعویٰ خون بہا کیا

کیوں سنگ یار سے خجل مجھ کو بس از قضا کیا
کہہ تیا استخواں میری تو نے یہ کیا ہما کیا

وصل کی رات ہم نشیں کیونکہ کٹے نہ پوچھ کچھ
در پہ صلح میں رہا اس پہ بھی وہ لڑا کیا

اپنی شرارتوں سے وہ باز نہ آیا اے نصیر
مجھ کو رلا کے ابر ساں برق ـــ ہنسا کیا

ایک اور غزل کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے۔

نو رتن بازو پہ جب وہ باندھ سہ پیکر اٹھا
لیلئ شب نے رکھا پروین کا جھومر اٹھا

دیکھنے کو تو نہ آئینہ محبت کافر اٹھا
درمیاں بہر خدا مت سد سکندر اٹھا

چشم مست یار کو ڈرتا ہوں دل دیتے ہوئے
ہے یہ شیشہ پھینک دے اس کو نہ پتھر پر اٹھا

☆ ☆ ☆

دل میں گر تو ہو تو ہم تو بھی کھینچیں ورنہ
شمع روشن کریں اس خانہ ویران میں کیا

مر گیا ہوں میں کسی پردہ نشین کے غم میں
قبر بنواتے ہو یارو میری میدان میں کیا

maablib.org

نظامؔ رامپوری

نام سید ذکریا شاہ المعروف بہ نظام شاہ، تخلص نظامؔ تھا۔ نظامؔ کا سلسلہ نسب بارھویں پشت میں حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے۔ ان کے جد اعلیٰ سید عبداللہ شاہ قبائلی علاقہ سے علی محمد خاں بانی ریاست روہیلکھنڈ کے عہد میں برصغیر میں آئے اور روہیلکھنڈ میں تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ان کی اولاد نے جاری رکھا۔ خاندان کے ایک بزرگ حافظ احمد شاہ نے رامپور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ نظامؔ نے ان سے شرف بیعت حاصل کی اور فن سخنوری میں ان ہی کے شاگرد ہو گئے۔ نظامؔ کو فارسی اور عربی میں کافی دستگاہ تھی۔ انہی دونوں زبانوں کے ذریعہ انہوں نے اردو زبان پر عبور حاصل کیا۔ بعد میں علی بخش بیمارؔ سے شرف تلمذ بھی حاصل کرلیا۔

ولی عہد ریاست رام پور نواب یوسف علی خاں کو شعرو سخن کا بے حد شوق تھا اور ناظمؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کی فرمائش پر نظامؔ نے بہت سی غزلیں کہیں اور خوب داد و دہش حاصل کی۔

نظامؔ کی شاعری میں دہلی اسکول کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ان کے اور داغؔ کے کلام میں ایک طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ صفائی، شگفتگی اور سلاست کلام کی خصوصیت ہے جو ان کے اشعار سے ظاہر ہیں۔

انتخاب "کلیات نظام" سے پیش کیا جاتا ہے۔

یوں آپ تو کہوں گا نہ رنجش کا ماجرا
پوچھو گے تم تو مجھ سے چھپایا نہ جائے گا

بس ایک بار کہہ دے جو کہنا ہے تجھ کو
نہ رک رک کے کہہ نامہ بر تھوڑا تھوڑا

یوں تو سبھی بھلے ہیں زمانے میں اے قلم
والے نہ پڑ کسی سے کسی کی خدا غرض

آپ سے ایسی بے وفائی ہو
یہ یقین آپ پہ نہیں آتا

ہاں پر اس نے تو کہا سب کچھ
تو نے بھی حال کچھ کہا میرا

یہ لگاوٹ، یہ کرشمہ، یہ ادا، یہ شوخی
تم منصف ہو، تمہیں پیار کروں یا نہ کروں

کیا اجازت فقط آنے کی یہانتک ہے مجھے
تم سے باتیں بھی میں دوچار کروں یا نہ کروں

وہ جھروکوں میں جو آجائیں تو اتنا پوچھوں
بستر اپنا پس دیوار کروں یا نہ کروں

maablib.org

نیرنگ کاکوروی

عبدالوحید نام 'نیرنگ' تخلص تھا۔ یہ منشی عبدالمجید سحر کاکوروی کے صاحبزادے تھے۔ گہوارہ علم و ادب قصبہ کاکوروی ضلع لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ زندگی کی اکیاسی (۸۱) بہاریں دیکھیں اور ۱۹۳۸ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی۔ والد منشی عبدالمجید سحر کاکوروی مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ دادا جناب ساحر کاکوروی شیخ علی حزیں، نظیری اور آرزو کے ہمعصر اور ہم پلہ شاعر خیال کیے جاتے تھے۔ نیرنگ کی ابتدائی تعلیم رسمی طور پر ہوئی۔ انھوں نے عربی مولانا شاہ علی انور قلندر کاکوروی سے اور فارسی مولوی محمد عباس علی فتح پوری سے حاصل کی۔ ملازمت کا آغاز ریاست سیتاپور سے ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ریاست جھالاوار چلے گئے۔ وہاں سے ریاست جھالاوار میں رہائش پذیر ہو گئے اور دربار سے وابستہ ہو گئے اور ۱۹۳۸ء تک ریاست کی خدمت انجام دے کر ریٹائرڈ ہو گئے۔

شاعری بچپن سے مزاج میں رچی بسی تھی۔ شعور کی منزل میں قدم رکھا تو شعر موزوں کرنے لگے۔ اپنے ماموں علامہ محسن کاکوروی کے شاگرد ہو کر طبع آزمائی کرنے لگے۔ سخت محنت اور مشق سخن سے کلام میں پختگی پیدا ہو گئی اور بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ مقامی لوگوں کے علاوہ خود ریاست جھالاوار کے راجہ نے ان سے شرف تلمذ حاصل کر لیا تھا۔ نیرنگ صاحب کے کمال فن کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں شاعر دربار بنا لیا اور افتخار الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا۔

نیرنگ نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا جسے راجہ بھوانی سنگھ کے صاحبزادے راجندر سنگھ نے دلچسپی و عقیدت کے ساتھ شائع کرایا۔ دیوان کا انتساب انھی سے منسوب تھا۔ پیش لفظ علامہ نورالحسن نیر کاکوروی اور دیباچہ خان بہادر قاضی عزیزالدین نے تحریر کیا تھا۔ جسے اہل علم و ادب نے بہت پسند کیا۔ کلام میں تغزل و ترنم کے علاوہ شوخی و رنگینی اور سوز و گداز بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

نمونۂ کلام حاضر ہے۔

حمد

چمکے فروغ حمد سے حسن رقم مرا
سجدے میں سر جھکائے ادب سے قلم مرا

رحمت کا اسکی خضر نہ ہوتا جو رہنما
کھل کر وہ وجود میں آتا عدم مرا

روز شمار ہونگے گناہ کس حساب میں
تم کہہ چکے ہو سب سے فزوں ہے کرم مرا

حاسد جلیں گے سوز جہنم کی آگ میں
محشر میں دیکھ کر جاہ و حشم مرا

نیرنگ کی دعا ہے الٰہی دم اخیر
تیرا زباں پہ نام ہو نکلے جو دم مرا

نعت

محفل قدس کی رونق کو بڑھانے والا
لامکاں میں کوئی مہمان ہے آنے والا

وہ براق نبوی خلد سے آنے والا
تیز مانند نظر عرش پہ جانے والا

میں چلا حشر میں روتا ہوا پیچھے پیچھے
آگے آگے مری بگڑی کا بنانے والا

بلبل دل کو سنا کے یہ صبا خوشخبری
تجھ کو وہ گل ہے مدینہ میں بلانے والا

سلام

سلامی اہلبیت مصطفیٰ محبوب یزداں ہیں
شعاع مہر ایماں آیۂ تفسیر قرآں ہیں

چلا جو راہ پر حسنینؑ کی پہنچا وہ منزل پر
یہی شمع حقیقت رہنمائے راہ عرفاں ہیں

انھیں کے چھوڑنا دین خدا کا چھوڑنا سمجھو
یہ دونوں سبط پیغمبر ہمارے جزو ایمان ہیں

انھی کے نام سے ہے گلشن امت کی زیبائش
گلستان رسالت کے یہ دونوں سرو بستان ہیں

روا ہوں حاجتیں گر صدق دل سے نام لے ان کا
یہ ماویٰ بیکسوں کا ہیں یہ ملجائے غریباں ہیں

غزل کے چند اشعار

زندگی بھر کوئی جانے نہ کسی پر مرنا
دیکھ اے دیدہ تر راز نہ افشاں کرنا

رنگ کیا کیا نہ زمانے کو بدلتے دیکھا
مگر ارمان کسی کا نہ نکلتے دیکھا

تیغ ابرو کے تصور کا نتیجہ نکلا
آنکھ کی راہ سے کٹ کٹ کے کلیجہ نکلا

نفیسؔ بھوپالی

تھامس جمز پینسٹ نام 'نفیسؔ' تخلص تھا۔ ان کے والد آئزک پینسٹ ۱۸۶۳ء میں فرانس سے ہندوستان وارد ہوئے اور بھوپال میں نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد میں پرنس آف ویلز اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ نفیسؔ ۱۸۶۰ء میں بمقام ریاست بھوپال پیدا ہوئے۔ مسلمانوں کے اخلاق و معاشرت سے متاثر ہو کر ۱۸۹۳ء میں مسلمان ہو گئے اور محمد سلیمان خاں عرف اچھے صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔ اگرچہ یہ بھوپال میں پیدا ہوئے تاہم فرانسیسی زبان اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انگریزی اور پرتگالی زبانیں بھی جانتے تھے۔ شعر و شاعری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ سن شعور کو پہنچ کر امیرؔ مینائی کے زمرہ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ استاد کی اصلاح و رہنمائی سے بھوپال کے ان مشاہیر شعراء میں شمار ہوتا تھا جنھوں نے بھوپال کے شعر و سخن کو حیات دوام بخشی۔ دہلی کی بامحاورہ شستہ زبان' بلند خیالی اور سلاست ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ کلام پابندی سے لکھنؤ کے معروف ادبی رسالے پیام یار" میں شائع ہوتا تھا۔

نفیسؔ کے فکر کا نمونہ حاضر ہے۔

زاہد جو تجھ کو اپنی عبادت پہ ناز ہے میں بھی گناہگار ہوں رب غفور کا
مرتے ہیں اور حسن عمل پاس کچھ نہیں توشہ نہیں بغل میں ارادہ ہے دور کا

☆ ☆ ☆

مجھے اشتیاق ہی تو ہے وہ ملے اتفاق ہی تو ہے
ب کہا مرتے ہیں کہا جی ہاں زندگی تم کو شاق ہی تو ہے
بلبل کو ہم کو نالہ پسند اپنا اپنا مذاق ہی تو ہے
بتا اس ہجر میں مآل نفیسؔ دیکھیں کیا ہو فراق ہی تو ہے

☆ ☆ ☆

اب ایسے وہ کہنے میں مرے آئے ہوئے ہیں
اغیار سے ملنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں

ہیں ایسے پریشاں مرے نالے وہ سن کر
دل تھامے ہوئے پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے ہیں

غرفے سے نہ جھانکو کہ مچل جائے گا پھر دل
ناداں ہے یہ ہم اسے بہلائے ہوئے ہیں

کیا کیا دل بیتاب میں گھبراتی ہے حسرت
مہمان مرے گھر میں جو وہ آئے ہوئے ہیں

☆ ☆ ☆

ے بڑھ چڑھ کے ہیں ظلم و ستم میں تری آنکھیں
فتنے سے، قیامت سے، چھلاوے سے، بلا سے

دل لینے پہ آتے ہیں تو لے لیتے ہیں دل کو
غمزہ سے، لگاوٹ سے، کرشمہ سے، ادا سے

کیا آئے شب وعدہ وہ اب بھی تو جدا ہیں
شوخی سے، نزاکت سے، شرارت سے، حیا سے

آخر میں نفیس کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے کہ ایک فرانسیسی شاعر جس کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اس نے کتنی عمدگی سے اپنا مافی الضمیر بیان کیا ہے۔

ے خوش طالعی میری جو تم آئے مرے گھر
پر یہ تو کہو بھول گئے راہ کدھر آج

ے ایسا نہ ہو وہ شوخ چلے بزم عدو میں
کھینچے لئے جاتا ہے تو اے شوق کدھر آج

ے اللہ ری بیتابی فرقت کہ بن اس کے
رہ رہ کے نفیس آتا ہے کچھ منہ کو جگر آج

وفا سہسرامی

عائشہ بیگم نام اور وفاؔ سہسرامی تخلص تھا۔ یہ قصبہ سہسرام ضلع شاہ آباد آرہ کی رہنے والی تھیں۔ تعلیم گھریلو تھی تاہم بزرگوں کے فیض صحبت نے سخن فہمی و سخنوری کے قابل بنا دیا تھا۔ موصوفہ کا کلام اس دور کے اردو رسالوں میں شائع ہوتا تھا۔ "تذکرہ نسواں" مرتبہ مولوی فصیح الدین بلخی میں ان کے یہ اشعار درج ہیں۔

نکلنا یاد ہے گلشن سے باغباں مجھ کو
میں آشیانے کو روتی ہوں آشیاں مجھ کو
کبھی حرم میں، کبھی دیر میں، کبھی دل میں
ملا ہے جلوہ نما تو کہاں کہاں مجھ کو
وفا اسیر قفس رہ کے چپ رہوں کیوں کر
ستا رہی ہے بہت یاد آشیاں مجھ کو

وحشت ملتانی

رحیم بخش نام اور وحشتؔ ملتانی تخلص تھا۔ ۱۸۹۶ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ معمولی لیاقت کے آدمی تھے۔ شاعری کی ابتداء ۱۹۱۸ء سے کی مگر کسی استاد فن سے تلمذ حاصل نہیں کیا۔ محض مشق اور ریاضت نے ان کے عارض ادب کو سنوارا ہے۔ ملتان میں بزم داغ کے صدر تھے۔ نمونہ کلام حاضر ہے ؎

خوں رلا کر تجھے اے دیدہ گریاں میں نے
کر دیا کوچہ جاناں کو گلستاں میں نے
مشعل عشق جلا کر سر مژگاں میں نے
بھر دیا بزم دوعالم میں چراغاں میں نے

دل میں بستے ہیں نگاران جہاں اے وحشتؔ
دل میں آباد کیا شہر نگاراں میں نے

عشق ہی حسن کو ہر طور جلا دیتا ہے
جس طرح ماہ کو خورشید ضیا دیتا ہے
جانے خاموش ہیں کیوں وادی ایمن والے
عشق تو آج بھی ارنی کی صدا دیتا ہے
کھل ہی جاتی ہے دوعالم کی حقیقت وحشتؔ
جام مے جب مجھے وہ ہوشربا دیتا ہے

یک رنگ دہلوی

غلام مصطفیٰ خاں نام اور یک رنگ تخلص تھا۔ یہ خاں جہاں لودھی کے نواسے یا پوتے تھے۔ ملازمان محمد شاہی میں سے تھے۔ معمولی لیاقت کے آدمی تھے۔ مگر شعر بہت عمدہ اور جلد موزوں کر لیتے تھے۔ شاہ مبارک آبرو کے ہم عصر تھے۔ باقاعدہ کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں تھا۔ کبھی مرزا مظہر جان جاناں کو اور کبھی خان آرزو کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور دہلی ہی میں انتقال کیا۔ آدمی یار باش تھے اور اپنے زمانہ میں کافی مشہور تھے۔ ان کا پانچ صد اشعار پر مشتمل دیوان بھی شائع ہوا تھا جو اب ناپید ہے۔ اشعار سے آمد، سلاست اور صفائی کا رنگ نمایاں ہے۔ کلام ملاحظہ کیجئے ؎

زباں شکوہ ہے مہندی کا ہر پات
کہ خوباں نے لگائے ہیں مجھے ہات

مسخر حسن کے شاہ و گدا ہیں
رکھے ہیں خوبرو ظاہر کرامات

خیال چشم و ابرو کر کے تیرا
کوئی مسجد پڑا کوئی خرابات

؎ نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
دل سے صبر و قرار جاتا ہے

کر خبر لیتی ہے لے صیاد
ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

؎ مجھے مت پوچھ پیارے اپنا دشمن
کوئی دشمن ہوا ہے اپنی جاں کا

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
مجھ کو دماغ دل رہا

یکتا لکھنوی

نواب مرزا ہادی خاں نام اور یکتا تخلص تھا۔ نواب سربلند خاں کے خاندان سے تعلق تھا۔ روشن الدولہ ان کے پردادا تھے۔ اگرچہ یکتا کی تعلیم بہت معمولی تھی تاہم رشک مرحوم کی صحبت و تلمذ کی وجہ سے شعر بہت عمدہ کہتے تھے۔ علم مجلس سے خوب واقف تھے۔ مزاج کی لاپرواہی کی وجہ سے اپنا کلام محفوظ نہیں رکھ سکے۔

جوانی میں پہلوانی کا بہت شوق تھا۔ کشتی بھی لڑتے تھے۔ لکھنؤ کے اس وقت کے ماحول کی وجہ سے بانکا بنے رہنے کا شوق تھا۔ ہاتھ فیروزے کی انگوٹھیوں سے بھرے رہتے تھے۔ لکڑی کے فن (پٹا) میں بھی اچھی مہارت رکھتے تھے۔

کلام درج ذیل ہے

آنکھ سے آنکھ ملانے کی قسم کھائی ہے
ایسی شرمیلی نگاہوں میں حیا آئی ہے

واہ رے پاس نزاکت چمنستاں ترا
کہ دبے پاؤں نسیم سحری آئی ہے

منہ چھپانے کی تو امید نہیں ہے یکتا
جان پہچان ہے برسوں کی شناسائی ہے

یقینؔ دہلوی

انعام اللہ خاں نام، یقیںؔ تخلص تھا۔ یہ ۱۷۲۷ء میں دلّی میں پیدا ہوئے اور ۱۷۵۵ء میں دلی میں ان کی مٹی عزیز ہو گئی۔ ان کا مرزا مظہرؔ جان جاں کے مشہور شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔ نہایت عمدہ اور مربوط غزل کہتے تھے۔ گردیزی، شفیقؔ، قائمؔ اور حاتمؔ نے ان کے کلام کی بے حد تعریف کی ہے۔ عبدالحیٔ نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ اگر یقیںؔ مزید زندہ رہتے تو میرؔ اور مرزا کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔ بدقسمتی سے عین جوانی میں ۲۹ سال کی عمر میں کسی دشمن نے پراسرار طور پر قتل کر دیا۔ یقیںؔ کی تعلیم بس واجبی سی تھی مگر موصوف نے اردو شاعری کو ایہام سے نکالا اور استادانہ طور پر فارسی محاوروں اور ضرب الامثال کو اردو شاعری میں اس طرح سمویا ہے جس سے ان کا کلام عجب لطف دیتا ہے۔ دیوان یقیںؔ مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ سے ان کے کلام کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

زنجیر میں زلفوں کے پھنس جانے کو کیا کہیے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا
اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیے

غزل

نہیں معلوم اب کے سال مے خانے پہ کیا گزرا
ہمارے توبہ کرنے سے پیمانے پہ کیا گزرا

مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے
نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گزرا

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے
خدا جانے تری صورت سے بت خانے پہ کیا گزرا

یقیںؔ کب یار میرا سوز دل کی داد کو پہنچے
کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانے کیا گزرا

فہرست کتب و رسائل جن سے استفادہ کیا گیا :۔

آب بقا'۔ آب حیات'۔ آثار المعاصرین (گلستان سخن)'۔ آثار الشعراء'۔ انتخاب یادگار'۔ اردو شاعری کی مختصر تاریخ'۔ اردو شاعری پر ایک نظر'۔ اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر'۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر'۔ اردو شاعری پر تبصرہ'۔ اردو کی مزاحیہ شاعری'۔ اردو شاعری کا انتخاب'۔ اردو کی منظوم داستانیں'۔ ارمغان گوکل پرشاد'۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'۔ اردو شاعری کے ۲۵ سال'۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء'۔ اردو شاعری کے ارتقاء میں ہندو شعراء کا حصہ'۔ اردو کے ہندو شعراء'۔ اردو کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'۔ اردو کے یورپین شعراء'۔ اترپردیش کے شعراء'۔

بمبئی میں اردو'۔ بلوچستان میں اردو'۔ بہار میں اردو زبان کا ارتقاء'۔ بزم آخر'۔ بزم سخن'۔ بنگال میں اردو شاعری انیسویں صدی کے آخر تک'۔ پنجاب میں اردو'۔

تذکرہ نکات الشعراء'۔ تذکرہ شعراء اردو (گل رعنا)'۔ تذکرہ شعراء ہند'۔ طبقات الشعراء'۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا'۔ تذکرہ جلوہ خضر'۔ تذکرہ ریاض الفصحا'۔ تذکرہ سخن الشعراء'۔ خمخانہ جاوید'۔ تذکرہ گلشن بے خار'۔ تذکرہ تبسم گل'۔ تصویر الشعراء'۔ تذکرہ آثار الشعراء ہنود'۔ تذکرہ شعراء دکن'۔ تذکرہ شعراء جےپور'۔ تذکرہ خندہ گل'۔ تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار'۔ تذکرۃ الخواتین'۔ تذکرہ اہل دہلی'۔ تذکرہ کاملان رامپور'۔ تاریخ ادب اردو'۔

جرأت ان کا عہد اور عشقیہ شاعری'۔ جنوبی افریقہ کے اردو شاعر'۔ جانے پہچانے اور جنہیں کوئی نہیں جانتا'۔ جدید شعراء اردو۔ چراغ دہلی'۔ چند شعراء بریلی'۔ چراغ محفل فصاحت'۔ چمنستان شعراء'۔ ہم اور وہ'۔ دلّی کا دبستان شاعری'۔ دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'۔ دہلی کی چند عجیب ہستیاں'۔ دلّی والے'۔ دلّی کا سنبھالا'۔ داستان اردو'۔ دلّی کی دو سو برس کی تاریخ'۔ یہ دلّی ہے۔ سندھ میں اردو شاعری'۔ سخنوران بلند فکر'۔ شہر آشوب'۔ شعراء الہند'۔ شعر العجم'۔ شمیم سخن'۔ شعراء اردو'۔ شاعرات اردو'۔ شعراء اردو کے تذکرے'۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری'۔ مجموعہ نغز'۔ مقدمہ شعرو شاعری'۔ ملتان میں اردو'۔ ملتان قدیم و جدید'۔ مغل اور اردو'۔ مدراس میں اردو'۔ مشرقی بنگال میں اردو ادب'۔ مسلم شعراء بہار'۔ متاع سخن۔ گلشنِ ہمیشہ بہار۔ گلدستۂ سخن، یادگار ضیغم

رسائل : ادب لطیف لاہور۔ ادبی دنیا' لاہور۔ ایشیاء' لاہور۔ ہمایوں' لاہور۔ نقوش' لاہور۔ فنون' لاہور۔ مخزن' لاہور۔ شام و سحر' لاہور۔ شباب' لاہور۔ زندگی لاہور۔ اردو ڈائجسٹ' لاہور۔ نیرنگ خیال' راولپنڈی۔ آجکل' دہلی۔ ساقی' دہلی۔ قومی زبان' دہلی۔ نگار' لکھنؤ۔ دلگداز' لکھنؤ۔ پیام یار' لکھنؤ' شاعر' بمبئی۔ اردو صحافت' کراچی۔ افکار' کراچی۔ ماہ نو' کراچی۔ دائرے' کراچی۔ جنگ (میگزین) کراچی۔ نوائے وقت (میگزین) لاہور وغیرہ وغیرہ۔

maablib.org